اُردو

بارہویں جماعت کی درسی کتاب

(Class - 12)

مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش

پریاگ راج

Rs. 17.00

راجیو پراکشن - پریاگ راج

تشکیل کمیٹی برائے نصابی کتب

زیرِ سرپرستی:

جناب **دیپک کمار**، اپر چیف سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشنل، حکومت اتر پردیش۔

زیرِ نگرانی:

ڈاکٹر **مہیندر دیو**، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (سکنڈری)، اتّر پردیش، لکھنؤ۔

کنوینر:

جناب **دِبیہ کانت شکلا**، سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اتّر پردیش، پریاگ راج۔

کوکنوینر:

جناب **اشوک کمار گپتا**، ایڈیشنل سکریٹری، (پا. پو. را)، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اتّر پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **شردھا شکلا**، ڈپٹی سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن، بورڈ، اتّر پردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **منیشا کشواہا**، اسسٹنٹ سکریٹری، سکنڈری ایجوکیشن بورڈ، اتر پردیش، پریاگ راج۔

مجلس مشاورت:

1۔ ڈاکٹر **ظفر اللہ انصاری** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔

2۔ ڈاکٹر **محمد کاشف** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، اتر پردیش۔

3۔ ڈاکٹر **فاضل احسن ہاشمی** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش۔

4۔ ڈاکٹر **نفیس احمد** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، سی. ایم. پی. ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔

5۔ ڈاکٹر **جگدمبا دوبے** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، حلیم مسلم پی. جی. کالج، کانپور، اتر پردیش

6۔ ڈاکٹر **شبنم رضوی** (ایسوسیئٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج لکھنؤ، اتر پردیش۔

7۔ ڈاکٹر **طاہرہ پروین** (اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو، ایس. ایس. کھنّا ڈگری کالج، پریاگ راج، اتر پردیش۔

مجلس تصنیف وتالیف:

1۔ جناب **ابوبکر خاں** (لکچرار) سی۔اے۔وی۔انٹر کالج، پریاگ راج۔

2۔ جناب **محمد ارشد** (لکچرار) جی۔آئی۔سی۔، پریاگ راج۔

3۔ جناب **عبدالحکیم** (لکچرار) مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج، پریاگ راج۔

4۔ ڈاکٹر **اجے مالوی** (لکچرار) اینگلو بنگالی انٹر کالج، پریاگ راج۔

5۔ محترمہ **خولہ ناز** (لکچرار) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

6۔ جناب **احسان احمد** (لکچرار) سینٹ اینڈ روج، انٹر کالج، گورکھپور۔

7۔ ڈاکٹر **شامہ عابدی** (لکچرار) کراستھویٹ انٹر کالج، پریاگ راج۔

8۔ محترمہ **شائستہ انجم** (لکچرار) راجکیہ ابھینو ودیالیہ، داندوپور، چاکا، پریاگ راج۔

9۔ ڈاکٹر **عصمت نیلو انصاری** (لکچرار) جی۔جی۔آئی۔سی۔ پرتاپ گڑھ۔

10۔ محترمہ **ثنا صدیقی** (لکچرار) پتراچار شکشا سنستھان، پریاگ راج۔

11۔ ڈاکٹر **عبدالمحی** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان، پریاگ راج۔

12۔ محترمہ **شائستہ اقبال** (لکچرار) ضلع شکشا و پراشکشن سنستھان،، فتح پور۔

13۔ ڈاکٹر **شکیل فاطمہ** (اسسٹنٹ ٹیچرر) حمیدیہ گرلس انٹر کالج، پریاگ راج۔

14۔ محترمہ **شبانہ انجم** (اسسٹنٹ ٹیچرر) جی.آئی.سی.، پریاگ راج۔

کوآرڈینیٹر:

محترمہ **بندو یادو**، لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اترپردیش، پریاگ راج۔

محترمہ **سنگیتا یادو**، لٹریری اسسٹنٹ، مادھیمک شکشا پریشد، اترپردیش، پریاگ راج۔

پورٹریٹ:

آشیس نرائن

پیش لفظ

اردو ہمارے ہندوستان کی ان زندہ زبانوں میں سے ہے جس کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے۔ اردو کے بولنے والے سارے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا ادبی سرمایہ بھی وقیع و وسیع ہے۔ اس نے ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ریاستِ اتر پردیش کو ابتدا ہی سے اس زبان کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہاں کے ادبا اور شعرا نے اس زبان کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کرکے اس کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ عوامی سطح پر بھی یہ زبان کافی مقبول رہی ہے اور اس کی مقبولیت کا خیال رکھتے ہوئے اس کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کی ترویج و اشاعت اور عروج و ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کسی بھی ملک کی ترقی اس کے تعلیمی و تدریسی معیار پر منحصر ہوتی ہے۔ جس ملک کا تعلیمی معیار جتنا بلند اور برتر ہوگا وہ ملک اتنا ہی ترقی یافتہ ہوگا لہٰذا تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے حکومتیں ہمیشہ کوشاں رہی ہیں ''جدید نظریۂ تعلیم 2020'' میں مختلف مضامین کے ساتھ ساتھ زبان کو وقیع و وسیع بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے 2022ء میں اتر پردیش حکومت کی جانب سے ایک نصابی کمیٹی عمل میں آئی جس نے جدید تعلیمی تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے نصاب پر غور وفکر کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کیں جن میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا کہ این.سی.ای.آر.ٹی. کے نصاب اپنائے جانے کی وجہ سے مقامی شعرا و ادبا کی تخلیقات نصاب سے خارج ہو جائیں گی۔ اس لیے ایس.سی.ای.آر.ٹی. نے یہ فیصلہ کیا کہ ماہرین زبان وادب اور اساتذہ کی ایک کمیٹی کے ذریعے این.سی.ای.آر.ٹی. کے طرز پر کتابیں شائع کرائی جائیں۔ ان کتابوں کے تیار کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ مذکورہ کتابوں کے

مشمولات طلبہ اور طالبات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوں اور ان کتابوں کی مدد سے وہ صحیح اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں،اس کے علاوہ اُن کے اندر زبان کی محبت اور ادب کا ذوق بھی پروان چڑھ سکے۔ان کتابوں سے ہمارے طلبہ وطالبات میں فکر وشعور،تنقیدی نقطۂ نظر اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی قدروں کے تئیں احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو۔

مذکورہ مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی مرحلوں میں اردو ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مرکزی وریاستی سطح کے مختلف اداروں سے متعلق اساتذہ شریک ہوئے اور کتابوں کی از سرِ نو تحریر و تالیف،ترتیب،تدوین اور نظرِ ثانی کا عمل سر انجام دیا۔ان کتابوں میں نصاب اور امتحان کے طریقوں کے سبھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مشقی سوالات میں تنوع رکھا گیا ہے اور اسباق دلچسپ بنانے کی غرض سے شعرا اور ادبا کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔اس ورکشاپ میں بورڈ کے تمام اراکین نے بڑی محنت،لگن اور پوری دلچسپی سے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا جس کے لیے وہ قابلِ تعریف وتحسین ہیں۔ اتر پردیش مادھیمک شکشا پریشد ان تمام ارکان وشرکا کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے ان کتابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مہیندر دیو
ڈائریکٹر (مادھیمک)/چیئرمین
مادھیمک شکشا پریشد، اتر پردیش
پریاگ راج

فہرست

حصہ نثر

نمبر شمار	مصنفین	عنوانات	صفحہ نمبر
1	میر امّن	قصہ ملک نیم روز کے شہزادے کا (داستان)	12
2	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ	خطوط غالب (مکتوب)	24
3	مولانا محمد حسین آزاد	اردو شاعری کے پانچ دور (تذکرہ)	30
4	خواجہ الطاف حسین حالی	غزل کی اصلاح (تنقید)	45
5	علامہ راشد الخیری	کربلا کا ننھا شہید (مضمون)	64
6	مولانا ابوالکلام آزاد	حکایت بادہ وتریاک (خطوط)	75
7	مولوی عبدالحق	ادب اردو اور چکبست (خاکہ)	89
8	آل احمد سرور	نیا ادبی شعور (تنقید)	99

حصہ شعرونظم

نمبر شمار	شعرا	مشمولات	صفحہ نمبر
		1- غزل (تبصرہ)	111
1	خواجہ میر دردؔ	I- جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا	113
		II- گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں	
		III- چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم	
2	میر تقی میرؔ	I- منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا	120
		II- اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا	
		III- بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں	
3	غالبؔ	I- دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت	127
		II- حیراں ہوں دل کو روؤں	
4	امیر مینائی	I- حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا	134
		II- تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر	
		III- مے پئیں کیا کہ کچھ فضا ہی نہیں	

5	چکبستؔ	I- فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا II- نہیں منظور جینا روشناسِ چارہ گر ہو کر III- شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے	141
6	فانیؔ	I- خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا II- جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور III- وہ ہی وہ ہیں مگر ظہور نہیں	148
7	اصغرؔ	I- آلام روزگار کو آساں بنا دیا II- نمود حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں III- مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں	155
8	مجازؔ	I- کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا II- اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم III- آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے	161
9	جذبیؔ	I- مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے II- ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ	167
10	نشورؔ واحدی	I- سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں II- وہ آئے اس طرف اور یوں بہ طرز خوش گوار آئے III- سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے	174

	2- مثنوی (تبصرہ)		182
1	میر حسنؔ	داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں	183
2	دیا شنکر نسیمؔ	حمد و نعت و مناجات	191
	ایضاً	آوارہ ہونا بکاولی کا۔۔۔۔	
	ایضاً	بیاہ ہونا بکاولی کا تاج الملوک کے ساتھ	
3	شوقؔ قدوائی	ترانۂ شوق	201
4	ڈاکٹر محمد اقبالؔ	ساقی نامہ	207
5	علی سردار جعفریؔ	سازِ حیات	215
	3- قصیدہ (تبصرہ)		220
1	ذوقؔ	در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم	221
2	غالبؔ	در مدح بہادر شاہ	231
	4- مرثیہ (تبصرہ)		240
1	میر انیسؔ	حضرت امام حسینؓ کا حضرت عباسؓ کو علم سونپنا	241
2	مرزا سلامت علی دبیر	طلوعِ صبح	257
3	صفیؔ لکھنوی	مرثیۂ حالی	263
4	اسرار الحق مجازؔ	گاندھی جی کی وفات پر	271
	5- قطعہ (تبصرہ)		275
1	اکبرؔ الہ آبادی	ختم بہار، مشرق و مغرب، نئی روشنی، کش مکش	276

2	اقبالؔ	ملّا اور بہشت	282
3	جوشؔ	انتظار، معذرت	288
4	اخترؔ انصاری	تاج، ٹیگور کی شاعری	294
		6- رباعی (تبصرہ)	299
1	میر انیسؔ	رباعی	300
2	پیارے صاحب رشیدؔ	رباعی	306
3	امجدؔ حیدرآبادی	رباعی	311
		7- جدید نظم (تبصرہ)	317
1	حالیؔ	اقبال مندی کی علامت	318
2	اکبرؔ	لب ساحل اور موج	325
3	چکبستؔ	آصف الدولہ کا امام باڑہ	330
4	اقبالؔ	شعاعِ اُمید	337
5	جوشؔ	آواز کی سیڑھیاں	345
6	افسرؔ میرٹھی	طلوع خورشید نو	351
7	اخترؔ شیرانی	نغمۂ زندگی	357
	ضمیمہ		362
	اصناف نثر	داستان، مکتوب، تذکرہ، تنقید، مضمون، خاکہ	363
	قواعد	(علم البیان)	369

حصہ نثر

(1)

میرامّن

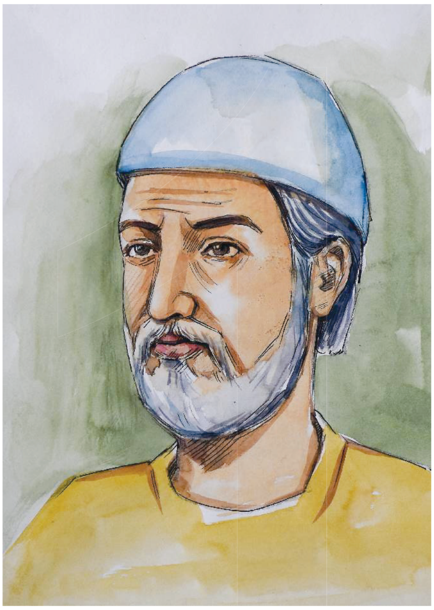

میرامن **1750**ء کے آس پاس دلی میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں اُن کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت ہوئی۔ لیکن جب احمد شاہ درانی کے حملے نے دلی کو تباہ کر دیا اور یہاں کے حالات بدتر ہو گئے تو انھوں نے دلّی چھوڑ دی اور عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں فکر معاش دامن گیر ہوئی تو کلکتہ پہنچے جہاں فورٹ ولیم کالج میں 4 مئی 1801ء کو انھیں چالیس روپے ماہوار پر نوکری مل گئی۔ اس کالج کے پرنسپل جان گل کرسٹ نے ان کو فارسی تصنیف 'قصہ چہار درویش' کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کام سونپا۔ انھوں نے نہایت ہی سادہ، سلیس اور بامحاورہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور 'باغ و بہار' نام رکھا۔ یہ کتاب مکمل صورت میں **1803**ء میں شائع ہوئی۔

باغ و بہار کا اسلوب نہایت ہی دلکش ہے اور اس کی دلکشی کا راز اس کے زبان و بیان میں پوشیدہ ہے۔ اس میں فقروں کی چستی، مکالموں کی دلفریبی، بیان کی شگفتگی و روانی پائی جاتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی نثر کو زندہ نثر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اردو کی مشہور ترین داستان ہے اور ترجمہ ہونے کے باوصف اس پر طبع زاد تخلیق ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ میر امن نے اس کتاب کے علاوہ 'گنج خوبی' بھی لکھی، لیکن انھیں باغ و بہار سے شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ نصاب میں شامل سبق اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

قصہ ملک نیم روز کے شاہ زادے کا

برس دن کے عرصے میں ہَرُ ج مَرُ ج کھینچتا ہوا شہر نیم روز میں جا پہنچا جتنے وہاں کے آدمی ہَزاری اور بَزاری نظر پڑے، سیاہ پوش تھے۔ جیسا احوال سنا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی دنوں کے بعد چاندرات ہوئی۔ پہلی تاریخ سارے لوگ اس شہر کے چھوٹے بڑے، لڑکے بالے، امرا بادشاہ، عورت مرد ایک میدان میں جمع ہوئے۔ میں بھی اپنی حالت میں حیران، سرگرداں اس کثرت کے ساتھ اپنے مال ملک سے جدا فقیر کی صورت بنا ہوا کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے اتنے میں ایک جوان گاوسوار منھ میں کف بھرے جوش خروش کرتا ہوا جنگل میں سے باہر نکلا۔ یہ عاجز جو اتنی محنت کر کے اس کے احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے حواس باختہ ہو کر حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جواں مرد قدیم قاعدے پر جو جو کام کرتا تھا کر کر پھر گیا اور خلقت شہر کی شہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا تب میں پچتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی؟ اب مہینے بھر پھر راہ دیکھنی پڑی! لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اس مہینے کو ماہ رمضان کی مانند ایک ایک دن گن گن کر کاٹا۔ بارے دوسری چاندرات آئی، مجھے گویا عید ہوئی۔ غرّے کو پھر بادشاہ خلقت سمیت وہیں جا کر اکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دل میں مصمّم ارادہ کیا کہ اب کی بار جو ہو سو ہو، اپنے تئیں سنبھال کر اس ماجرائے عجیب کو معلوم کیا چاہیے۔

ناگاہ جوان بدستور زرد بیل پر زین باندھے سوار ہوا آ پہنچا اور اُتر کر دو زانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سیف اور ایک ہاتھ میں بیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام ہر ایک کو دکھا کر لے گیا آدمی دیکھ کر رونے لگے۔ اُس جوان نے مرتبان پھوڑا اور غلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جدا ہو گیا۔ اور آپ سوار ہو کر مڑا۔ میں اُس کے پیچھے جلد قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا یہ کیا کرتا ہے؟ کیوں جان بوجھ کر مرتا ہے! اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں آیا ہے،

تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں، مر رہیو۔ ہر چند میں نے منّت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صورت سے ان کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گزرا۔

جب وہ بھی مہینا تمام ہوا اور سلخ کا دن آیا، صبح کو اسی صورت سے سارے عالم کا وہاں اِزدحام ہوا۔ میں الگ سب سے نماز کے وقت اٹھ کر آگے ہی جنگل میں جو عین اس جوان کی راہ پر تھا گھس کر چھپ رہا کہ یہاں تو کوئی میرا مزاحم نہ ہوگا۔ وہ شخص اسی قاعدہ سے آیا اور وہی حرکتیں کر کر سوار ہوا اور چلا میں نے اس کا پیچھا کیا اور دوڑتا دھوپتا ساتھ ہولیا۔ اُس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے۔ ایک بارگی باگ موڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھر کا تلوار کھینچ کر میرے سر پر آپہنچا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے میں نے نہایت ادب سے نہڑ کے سلام کیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا رہ گیا۔ وہ قاعدہ داں مُتَکلم ہوا کہ اے فقیر تو ناحق مارا گیا ہوتا پر بچ گیا۔ تیری حیات کچھ باقی ہے۔ جا کہاں آتا ہے! اور جڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آویزہ لگا ہوا کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا اس وقت میرے پاس کچھ نقد موجود نہیں جو تجھے دوں اس کو بادشاہ پاس لے جا جو تو مانگے گا ملے گا ایسی ہیبت اور ایسا رعب اس کا مجھ پر غالب ہوا کہ نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت، مُنہ میں گھگی بندھ گئی، پانو بھاری ہو گئے۔

اتنا کہہ کر وہ غازی مردنعرہ بھرتا ہوا چلا۔ میں نے دل میں کہا ہر چہ باداباد! اب رہ جانا تیرے حق میں بُرا ہے، پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر میں بھی روانہ ہوا۔ پھر وہ پھرا اور بڑے غصہ سے ڈانٹا اور مقرر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ اے رستمِ وقت کے! ایسی ہی ایک سیف مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے اور اِس حیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ وہ بولا کہ اے شیطان کی صورت! کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے۔ اور مجھے گنہگار بناتا ہے! جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟ میں نے اس کا کہا نہ مانا اور قدم آگے دھرا۔ پھر اُس نے دیدہ و دانستہ آنا کانی دی اور میں پیچھے لگ لیا۔ جاتے جاتے دو کوس وہ جھاڑ جنگل طے کیا ایک چار دیواری نظر آئی۔ وہ جوان دروازے پر گیا اور نعرۂ مہیب مارا۔ وہ در آپ سے آپ کھل گیا۔ وہ اندر بیٹھا میں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا، الٰہی اب کیا کروں! حیران تھا۔ بارے ایک دم کے بعد غلام آیا اور پیغام لایا کہ

چل تجھے روبرو بلایا ہے شاید تیرے سر پر اجل کا فرشتہ آیا ہے۔ کیا تجھے کم بختی لگی تھی! میں نے کہا: زہے نصیب اور بے دھڑک اس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر فرّاشی سلام کیا اس نے اشارت بیٹھنے کی کی۔ میں ادب سے دوزانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں، کہ وہ مرد اکیلا ایک مسند پر بیٹھا ہے۔ اور ہتھیار زرگری کے آگے دھرے ہیں اور ایک جھاڑ زمرد کا تیار کر چکا ہے۔ جب اس کے اٹھنے کا وقت آیا، جتنے غلام اس شہہِ نشیں کے گرد و پیش حاضر تھے، حجروں میں چھپ گئے، میں بھی مارے وَسواس کے ایک کوٹھری میں جا گھسا۔ وہ جوان اٹھ کر سب مکانوں کی کنڈیاں چڑھا کر باغ کے کونے کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چلاّنے کی آواز میرے کان میں آئی، کلیجا کانپنے لگا۔ لیکن اس ماجرے کی دریافت کرنے کی خاطر یہ سب آفتیں سہیں تھیں۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وہ سونٹا جس سے مارتا تھا، ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قفل کنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر وہیں باہر نکل کر نرگاؤ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور منھ چوما اور دانا گھاس کھلا کر ایدھر کو چلا۔ میں دیکھتے ہی جلد دوڑ کر کوٹھری میں جا چھپا۔

اس جوان نے زنجیریں سب دروازوں کی کھول دیں، سارے غلام باہر نکلے۔ زیرانداز اور سلپچی آفتابہ لے کر حاضر ہوئے۔ وہ وضو کر کر نماز کی خاطر کھڑا ہوا جب نماز ادا کر چکا، پکارا کہ وہ درویش کہاں ہے؟ اپنا نام سنتے ہی میں دوڑ کر روبرو جا کھڑا ہوا۔ فرمایا بیٹھ، میں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ آیا، اس نے تناول فرمایا مجھے بھی عنایت کیا۔ میں نے بھی کھایا۔ جب دسترخوان بڑھایا اور ہاتھ دھوئے غلاموں کو رخصت دی کہ جا کر سو رہو۔ جب کوئی اس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہم کلام ہوا، اور پوچھا کہ اے عزیز! تجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے جو تو اپنی موت کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے؟ میں نے اپنا احوال آغاز سے انجام تک جو کچھ گزرا تھا، تفصیل وار بیان کیا اور کہا: آپ کی توجہ سے اُمّید ہے کہ اپنی مراد کو پہنچوں۔ اس نے یہ سنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے ہوش ہوا اور کہنے لگا، بارِ خدایا! عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے، جس کی نہ پھٹی ہو بوائی کیا جانے پیر پرائی۔ اس درد کی قدر جو دردمند ہو، سو جانے۔

آفتوں کو عشق کی ، عاشق سے پوچھا چاہئے
کیا خبر فاسِق کو ہے ، صادق سے پوچھا چاہئے

بعد ایک لمحے کے ہوش میں آ کر ایک آہِ جگر سوز بھری سارا مکان گونج گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ بھی اسی عشق کی بلا میں گرفتار ہے اور اسی مرض کا بیمار ہے۔ تب تو میں نے دل چلا کر کہا کہ میں نے اپنا احوال سب عرض کیا، آپ توجہ فرما کر اپنی سرگزشت سے بندے کو مطلع فرمایئے تو بہ مقدور اپنے پہلے تمہارے واسطے سعی کروں اور دل کا مطلب کوشش کر کر ہاتھ میں لاؤں۔

القصہ وہ عاشق صادق مجھ کو اپنا ہمراز اور ہمدرد جان کر اپنا ماجرا اس صورت سے بیان کرنے لگا کہ سن اے عزیز! میں بادشاہ زادۂ جگرسوز اس اقلیم نیم روز کا ہوں۔ بادشاہ یعنی قبلہ گاہ نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رَمّال اور پنڈت جمع کئے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو، اور جنم پتری درست کرو اور جو جو کچھ ہونا ہے حقیقت پَل پَل گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دن دن، مہینے مہینے اور برس برس کی مُفَصّل حَضور میں عرض کرو۔ بہ موجب حکمِ بادشاہ کے سب نے متفق ہو اپنے اپنے علم کی رو سے ٹھہرا اور سادھ کر التماس کیا، کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور سبھ لگن میں شہزادے کا تولد ہوا اور جنم ہوا ہے کہ چاہئے سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادل ہو اور جتنے علم اور ہنر ہیں، ان میں کامل ہو اور جس کام کی طرف دل اس کا مائل ہو بہ خوبی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جاویں، لیکن چودہ برس تلک سورج اور چاند کے دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے، بلکہ یہ وسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبراوے جنگل میں نکل جاوے اور چرند و پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اس کا تقید رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پاوے جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سکھ اور چین سے سلطنت کرے۔

یہ سُن کر بادشاہ نے اسی لیے اس باغ کی بِنا ڈالی اور مکان مُتعدِّد ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اوپر ایک برج نَمدے کا تیار کروایا کہ دھوپ اور چاندنی اس میں سے نہ چھنے۔ میں دائی، دودھ پلائی اور

انگا چھُو چھُو اور کئی خواصوں کے ساتھ اِس مُحافظت سے اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا اور ایک استاد دانا، کارآزمودہ واسطے میری تربیت کے مُتَعیّن کیا، تو تعلیم ہر علم و ہنر کی اور مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خبر گیراں رہتے۔ دم بہ دم کی کیفیت روز مرّہ حضور میں عرض ہوتی۔ میں اُس مکاں کو عالم دُنیا جان کر کھلونوں اور رنگ بہ رنگ پھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں۔ جو چاہتا سو کھاتا۔ دس برس کی عمر تک جتنی صنعتیں اور قابلیتیں تھیں، تحصیل کیں۔

ایک روز اس گنبد کے نیچے روشن دان سے ایک پھول اچنبھے کا نظر پڑا کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑلوں جوں جوں میں ہاتھ لمبا کرتا تھا وہ اونچا ہوتا جاتا تھا۔ میں حیران ہو کر اُسے تک رہا تھا، وونہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اُس کے دیکھنے کو گردن اٹھائی دیکھا تو نمدا چیر کر ایک مکھڑا چاند کا سا نکل رہا ہے دیکھتے ہی اُس کے میرے عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مرصّع کا تخت پری زادوں کے کاندھے پر معلّق کھڑا ہے اور ایک تخت نشیں تاج جواہر کا سر پر اور خلعت جھلا بور بدن میں پہنے ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لیے اور شراب پیتے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ تخت بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر اُس برج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بلایا، اور اپنے نزدیک بٹھایا، باتیں پیار کی کرنے لگی، اور منہ سے منہ لگا کر ایک جام شراب گل گلاب کا میرے تئیں پلایا اور کہا آدمی زاد بے وفا ہوتا ہے لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ ایک دم میں ایسی ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دل محو ہو گیا اور ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ زندگانی کا مزا پایا اور یہ سمجھا کہ آج تو دنیا میں آیا۔

حاصل یہ ہے کہ میں تو کیا ہوں؛ کسوٗ نے یہ عالم نہ دیکھا ہوگا، نہ سنا ہوگا اُس مزے میں خاطر جمع سے ہم دونوں بیٹھے تھے کہ کُریال میں غلیلا لگا۔ اب اس حادثۂ ناگہانی کا ماجرا سُن کہ وونہیں چار پری زاد نے آسمان پر سے اُتر کر کچھ اُس معشوق کے کان میں کہا، سنتے ہی اس کا چہرہ تغیر ہو گیا اور مجھ سے بولی کہ اے پیارے دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اسی طرح ہمیشہ آؤں یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ پر یہ آسمان دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے، جاناں! تیرا خدا نگہبان ہے۔ یہ سن کر میرے حواس جاتے رہے اور طوطے ہاتھ کے اڑ

گئے۔ میں نے کہا کہ اَجی اب پھر کب ملاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سنائی! اگر جلد آؤ گی تو مجھے جیتا پاؤ گی نہیں تو پچتاؤ گی، یا اپنا ٹھکانا اور نام ونشان بتاؤ کہ میں ہی اس پتے پر ڈھونڈ ھتے ڈھونڈ ھتے اپنے تئیں تمھارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سن کر بولی، دور پار شیطان کے کان بہرے! تمھاری صد وبیست سال کی عمر ہووے، اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی۔ میں جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہ قاف میں رہتی ہوں۔ یہ کہہ کر تخت اٹھایا اور جس طرح اُترا تھا وونہیں بلند ہونے لگا۔

جب تک سامنے تھا میری اور اُس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں۔ جب نظروں سے غائب ہوا یہ حالت ہوگئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی اداسی دل پر چھا گئی، عقل وہوش رخصت ہوا، دنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہوگئی، حیران پریشان، زار زار رونا اور سر پر خاک اڑانا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانے کی سدھ، نہ بھلے برے کی بدھ۔

معنی واشارے:

سیاہ پوش	کالے کپڑے پہنے ہوئے
احوال	حال کی جمع
سرگرداں	پریشان
پردۂ غیب	عالم باطن
گاؤ	گائے
حواس باختہ	حال سے بے حال
قدیم	پُرانا
مصمم ارادہ	مضبوط ارادہ
بدستور	دستور کے مطابق
قلق	غم، افسوس
اژدحام	بھیڑ، ڈھیر
مزاحم	روکنے والا، حائل
ہیبت	ڈر یا خوف
غازی	بہادر
نعرۂ مہیب	ہیبت ناک نعرہ
روبرو	آمنے سامنے
وسواس	برے خیال

سلپچی آفتابہ	ایک برتن جس میں ہاتھ منہ دھوتے ہیں
خاصہ	کھانا
طالع	قسمت
مفصل	تفصیل سے
تولد ہوا	پیدا ہوا
ساعت	وقت یا گھڑی
شجاعت	بہادری
سخاوت	فیاضی
متعدد	کئی
نمدا	پردہ یا اون کی تہہ جما کر بنا کپڑا
مرصّع	سجا ہوا
خلعت	لباس
تغیر	تبدیلِ حالات یا انقلاب
ہاتھ کے طوطے اڑنا	بے حد گھبرا جانا
زار زار رونا	بہت زیادہ رونا
ناک میں دم کرنا	پریشان کر دینا

معروضی سوالات:

1۔ میرامن کہاں پیدا ہوئے؟

(i) آگرہ
(ii) دلّی
(iii) لکھنؤ
(iv) کلکتہ

2۔ میرامّن کس کالج سے وابستہ تھے؟

(i) دلی کالج
(ii) علی گڑھ کالج
(iii) فورٹ ولیم کالج
(iv) مولانا آزاد کالج

3۔ میرامّن کی مشہور داستان ہے؟

(i) باغ و بہار
(ii) داستانِ امیر حمزہ
(iii) آرائش محل
(iv) فسانۂ عجائب

4۔ میرامن کی زبان کیسی ہے؟

(i) سادہ و سلیس
(ii) مشکل پسند
(iii) مقفّٰی و مسجّع
(iv) دقیق

5۔ داستان باغ و بہار کس سن میں شائع ہوئی؟

(i) 1803ء
(ii) 1810ء
(iii) 1800ء
(iv) 1811ء

مختصر ترین سوالات:

1۔ باغ و بہار کس فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے؟

2۔ ’زارزار رونا‘ کو اپنے جملے میں استعمال کیجیے۔

مختصر سوالات:

4۔ نصاب میں شامل سبق ’’قصہ ملک نیم روز کے شاہ زادے کا‘‘ کس داستان سے ماخوذ ہے؟

5۔ میرامن سے گلکرسٹ کی ملاقات کہاں ہوئی؟

تفصیلی سوالات:

1۔ درج ذیل اقتباس کی تشریح مع سیاق وسباق کیجیے۔

میں اس کے پیچھے جلد جلد قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا یہ کیا کرتا ہے، کیوں جان بوجھ کر مرتا ہے؟ اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں ہے تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں۔ مر رہیو۔ ہر چند میں نے منت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صورت سے ان کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گزرا۔

2۔ نصاب میں شامل سبق ’’قصہ ملک نیم روز کے شاہ زادے کا‘‘ کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

3۔ میرامن کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(2)

اسد اللہ خاں مرزا غالبؔ

[پیدائش 1797ء، وفات 1869ء]

غالبؔ نے شاعری اور نثر نگاری دونوں میں اپنی شناخت قائم کی۔ ان کا اصل نام اسد اللہ خاں تھا اور ان کی ولادت 1797ء کو آگرہ میں ہوئی۔ ان کے والد عبد اللہ بیگ راجہ بختاور سنگھ کے ملازم تھے۔ 1801ء میں کسی لڑائی میں مارے گئے اس لیے ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے قبول کی۔ مرزا صرف نو برس کے تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مرحوم کے وارثین کی پنشن مقرر ہو گئی جس میں سات سو روپے سالانہ مرزا کو بھی ملتا تھا۔ 1857 کا ہنگامہ ہوا تو مرزا کو باغیوں میں شمار کر کے پنشن بند کر دی گئی۔ جس سے ان کے خانگی حالات متاثر ہوئے۔ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے انھیں بہت تگ و دو کرنی پڑی۔ آخر کار انھیں کامیابی ملی اور ان کی پنشن بحال کر دی

گئی۔1869ءکو دلّی میں ان کا انتقال ہوا۔اس وقت 73 برس کے تھے۔

مرزا غالب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی۔انھوں نے اردو میں جو خطوط لکھے وہ اردو نثر کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔غالب کے زمانے میں فارسی میں خط لکھنے کا رواج تھا۔وہ خود بھی فارسی میں خط لکھتے تھے۔لیکن 1849ءکے آس پاس اردو میں خطوط لکھنے لگے۔

مرزا غالب نے مکتوب نگاری کو نئے طرز واسلوب سے آشنا کرایا۔ان کے خطوط میں پر تکلف انداز نہیں ملتے۔وہ بڑے القاب وآداب سے بھی اجتناب کرتے ہیں جس کے باعث ان کے خطوط میں فطری حسن پیدا ہوجاتا ہے۔وہ اپنے خطوط میں اپنے شخصی حالات واقعات، اپنے زمانے کی صورت حال، ادبی اور شعری مباحث وغیرہ کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اُن کے خطوط معلومات کا خزانہ بن جاتے ہیں۔'عود ہندی' اور 'اردوئے معلّٰی' اُن کے خطوط کے دو مجموعے ہیں جن میں اردو نثر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

زیر درس سبق خطوط غالب کے مجموعے ''عود ہندی'' سے ماخوذ ہے۔اس سبق میں غالب نے ''نواب انوار الدولہ سعد الدین خان شفق کے نام'' جو خط لکھا ہے۔خود سے خطاب کیا ہے۔اس میں القاب وآداب بندگی وتسلیم جیسے الفاظ کو مزاحیہ انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

(1)

نواب انوارالدولہ سعدالدین خان بہادر شفق کے نام

کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوش مندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں نہ القاب نہ آداب نہ بندگی نہ تسلیم سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن ''ایاز قدر خود بشناس'' مانا کہ تو نے کئی برس بعد رات کو دو بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ۔ پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکر ادا کر اور یہ کہہ جو میں تصور کر رہا تھا وہ ہوا یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا، اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ ان شاءاللہ تعالی رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آ گیا ہے۔ اگر صرف تبرید، تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بہ حسب رائے طبیب تنقیہ کرائیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ شب کو ناگاہ ایک نئی زمیں خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی غزل تمام کی اسی وقت سے یہ خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سنا دیں اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور ان کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے۔ فقط

(2)

نواب انوارالدولہ سعدالدین خان بہادر شفق کے نام

پیرومرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب وآداب نہیں لکھتا خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ آج شہر میں بدرالدّین علی خاں کا نظیر نہیں پس مُہر اور کون کھود سکے گا ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ جو میرے نام تھا وہ ان کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے رقعہ میرے نام کا آج بھیجا سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قسم دوم پکھراج کی کیا ہے آپ اس کو سمجھ لیں اور رنگین باحتیاط ارسال فرمادیں۔ روپے کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے جب میں عرض کروں تب بھیجئے گا۔ تعجّب ہے کہ جناب میر امجد علی صاحب قلق کا اس خط میں سلام نہ تھا۔ متوقع ہوں کہ چھاپہ کے قصیدے ان کو سنائے جاویں اور میری بندگی کہی جائے۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام بصدق ہزار اشتیاق پہنچے۔

معنی اور اشارے:

ایاز	محمود غزنوی کے ایک غلام کا نام
ایاز قدر خود بشناس	ایاز اپنی حیثیت سے واقف ہے
تسلیم	سلام
ارباب ہوش	ہوش مند لوگ
عنایت نامہ	مکتوب، خط
حرارت	بخار، گرمی
ہنوز	ابھی، اب تک
تبرید	ٹھنڈائی، ٹھنڈا کرنا، تروتازہ، ٹھنڈا کرنے والا شربت
تعدیل	معتدل کرنا مزاج کا، برابر اور درست کر دینا
تنقیہ	مسہل، پاک کرنا، اخلاقی یا جسمانی اصلاح، فیصلہ، صفائی
منضج	وہ دوائیں جو مسہل سے پہلے دی جاتی ہیں، پکا دینے والا

معروضی سوالات:

1۔ غالبؔ کا اصل نام کیا ہے؟

(i) اسداللہ خاں (ii) عبداللہ بیگ

(iii) نصیراللہ (iv) ہرگوپال

2۔ غالبؔ کی ولادت کب ہوئی؟

(i) 1797 (ii) 1890

(iii) 1897 (iv) 1700

3۔ ''عودہندی'' اور ''اردوئے معلّیٰ'' کس مکتوب نگار کے خطوط کے مجموعے ہیں؟

(i) مرزامحمد قتیلؔ (ii) ابوالکلام آزاد

(iii) مرزاغالبؔ (iv) رجب علی بیگ سرورؔ

4۔ مرزاغالبؔ نے کس سن سے اردو زبان میں خط لکھنا شروع کیا۔

(i) 1840 (ii) 1849

(iii) 1850 (iv) 1841

مختصر ترین سوالات:

1۔ مرزاغالبؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

2۔ 'اردوے معلّیٰ' کس کی تصنیف ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ مرزاغالبؔ نے اردو میں خط لکھنا کب شروع کیا؟

2۔ مرزاغالبؔ کے خطوط کے مجموعوں کے نام لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ غالبؔ کے خطوط نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

2۔ ''غالبؔ کے خطوط اپنے وقت کا آئینہ ہیں'' اس قول کی وضاحت کیجیے۔

3۔ غالبؔ کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے۔

(3)

مولانا محمد حسین آزاد

[پیدائش 1830ء، وفات 1910ء]

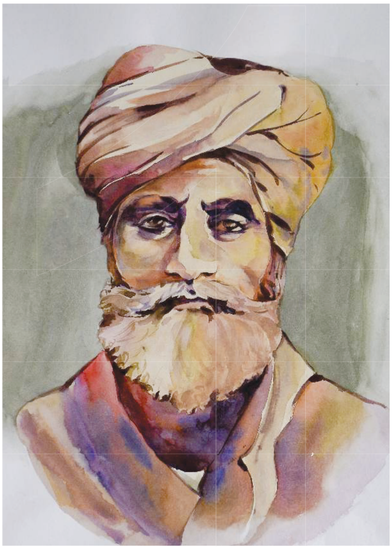

محمد حسین آزاد 1830ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر کا شمار شہر کے ممتاز علماء واد باء میں ہوتا ہے۔ انھیں دہلی سے اردو کا پہلا اخبار نکالنے کا فخر حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں سے مروجہ علوم کی تکمیل کی۔ شاعری میں استاد ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی میں انھیں کچھ زیادہ ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے والد کو انگریزوں نے گولی ماردی اور گھر بار لوٹ لیا گیا۔ دنیا نظروں میں تاریک ہوگئی۔ کچھ دنوں تک آزاد بے خانماں ہوکر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ جب آگ بجھی تو لاہور پہنچے۔ اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ 1864 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اور 1884 میں اورینٹل

کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ 1887 میں حکومت ہند نے انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اسی دوران 1865 میں آزاد نے ''انجمن پنجاب'' قائم کی اور لاہور میں جدید شاعری کی شمع روشن کی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام انھوں نے نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد رکھی جس میں مصرع طرح کے بجائے عنوانات پر نظمیں پڑھی جاتی تھی 1889ء میں بیٹی کی وفات کے بعد آزاد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اور اسی عالم میں 1910ء لاہور میں ان کا انتقال ہوگیا۔

محمد حسین آزاد، اردو کے ایک نامور انشاء پرداز، صاحب طرز ادیب، شاعر، نقاد، مورخ اور ماہر تعلیم ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو بہت گراں قدر تصنیفات دی ہیں۔ ان میں 'سخن دان فارس'، 'قصص ہند'، 'دربار اکبری'، 'نگارستان فارس'، 'نصیحت کا کرن پھول'، 'دیوان ذوق' اور 'نیرنگ خیال' کافی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ نصابی کتابوں میں اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب اور قواعد اہمیت کی حامل ہیں۔ مگر آزاد کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت 'آب حیات' سے ملی۔ یہ آزاد کی ایسی تصنیف ہے جسے کلاسیکی شاعری کا جدید تذکرہ شمار کیا جاتا ہے۔ اگر چہ اس کا موضوع اردو شاعری کی تاریخ ہے۔ تاہم اس میں اہم لسانی مباحث شامل ہیں۔ اس میں انھوں نے اردو زبان کی تاریخ کا نظریہ پیش کیا اور اردو شاعری کے آغاز وارتقاء سے بحث کی ہے۔ اس کتاب نے اردو تنقید کو نقش اول عطا کیا۔ اس میں شاعروں کے حالات زندگی اور شاعری کے تجزیوں میں قدیم تذکروں کے مروجہ انداز سے انحراف کیا گیا ہے۔ آزاد نے پوری ادبی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی شاعری کی نمائندہ خصوصیات سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب تاریخی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، انشاء پردازی میں اس کتاب کو اردو ادب کی لازوال تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ زبان کی لطافت اور شائستگی کی وجہ سے یہ کتاب اعلیٰ نثر کا عمدہ نمونہ بھی ہے۔

نصاب میں شامل زیر نظر مضمون 'اردو شاعری کے پانچ دور' 'آب حیات' سے لیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے پوری اردو شاعری کو پانچ ادوار میں منقسم کر کے ہر دور کی شاعری کی نمائندہ خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو شاعری کے پانچ دور

پہلا دور[1]: نظم اردو کے عالم کا پہلا نو روز ہے۔ نفسِ ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولیؔ نے آ کر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعتہً حرارت برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔ ان بزرگوں کی باتیں تو ان کے شعروں سے سن بھی سکتے ہو مگر حیران ہوں کہ صورت کیوں کر دکھا دوں۔ اوّل تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل۔ اس پر میں زبان کا اپاہج۔ اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں کہ ادب کی آنکھ ان کی متانت پر نظر نہیں اٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ ان کی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی۔

دیکھو! جلسہ مشاعرہ کا امرا و شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں کوئی کٹاری باندھے ہے، کوئی سیف لگائے ہے، بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا، اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نو جوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ ان شوخیوں سے انھیں کچھ اور مطلب نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں۔

اس دور میں ولیؔ تو مجلس کی شمع ہیں اور اہل مجلس دلّی اور دکن کے شریف و نجیب، فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں

[1]: اس دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں۔ ولی اللہ ولیؔ، شاہ مبارک آبروؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ، محمد شاکر ناجیؔ، محمد حسن احسنؔ، غلام مصطفیٰ خان یک رنگؔ۔

روشنی سے دیکھتے ہیں اسی ان کی زبان ایک ہی سمجھنی چاہئے۔ مگر وؔلی نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذو معنین سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہوگیا۔ شاید دُہروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خودرو تھا، اس نے اپنا رنگ دیا۔ اگر چہ وؔلی کے بعد دلّی میں سینکڑوں صاحب طبع دیوان بنانے پر کمر بستہ ہو گئے مگر میں اس مشاعرے میں چند ایسے بزرگوں کو لاتا ہوں جن کے ناموں پر اس وقت کے معرکوں میں استادی کا چتر شاہی سایہ کئے تھا اور غالباً اس زبان کا نمونہ شعر کا انداز دکھانے کو اس قدر کافی ہوگا۔ ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پیچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے نہیں بولتے اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسبِ حال ہوتی ہے۔ اسی واسطے لطف انگیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیمی اور مضمون بھی اکثر سبک اور مبتذل ہوں گے۔ مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے۔ میں خود نہیں کہتا۔ فلاسفۂ سلف کا قول سنتا ہوں کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہے۔ پس انسان وہی ہے کہ جس پیرائے میں خوبصورتی جوبن دکھائے یہ اس سے کیفیت اٹھائے نہ کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط گل و گلزار ہی پر دیوانہ پھرے۔ نہیں! ایک گھاس کی پتی بلکہ سڈول کانٹا خوش نما ہو تو اس کی نوک جھوک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے۔

دوسرا دور[1]: اس فصل میں زبان کے حسن قدرتی کے لیے موسم بہار ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں۔ حسن قدرتی کیا شے ہے؟ ایک لطف خداداد ہے جس میں بناؤ سنگار

1: دوسرے دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں: شاہ حاتؔم، شاہ تسلیؔم، سعادت یار خاں رنگیؔن، محمد ابن نثاؔر، میاں ہدایتؔ، خان آرزوؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ۔

کا نام بھی آ جائے تو تکلف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں۔ ان کا گل زار نیچر کی گل کاری ہے۔ صنعت کی دست کاری یہاں آ کر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے، جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ ہاں! طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری، اُپج، پلٹی، تان کسی گوّیے سے لے کر نہیں ڈالی۔ تم دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا ایسا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے اور جب تک سننے والے سنیں گے، کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن، جس کے سادہ پن پر ہزار ہا بانکپن قربان ہوتے ہیں۔

ع ؎ ہے حسن وہی جس میں بے ساختہ پن نکلے

ان کی اصلاح نے بہت سے لفظ وؔلی کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی 'بھلہ رے' اور 'دھیرے دھیرے' اور 'مرے ہے' بجائے مرتا ہے اور 'دوانہ' بجائے دیوانہ اور 'میاں' اور 'فقط' اور 'جان' کا لفظ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ 'جان جاں' یا 'جاناں' یا 'یار' یا 'دوست' یا 'دلبر' وغیرہ وغیرہ بولنے لگے مگر 'موہن' دورِ دوم میں نہ رہا۔ 'سجن' رہا اور 'بل گیا'، یعنی جل گیا اور 'بل گیا' یعنی صدقے گیا اور 'من' بجائے دل بھی ہے۔

سید انشا ایک جگہ بعض الفاظ مذکورہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس عہد کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ شرفا بولتے تھے۔ 'پروٹھا' بجائے 'پراٹھا' اور 'دھیرا' بجائے آہستہ یا 'متوقِف' اور بمعنی طرف اور 'بھیچک' 'معنی حیران' اور 'تئیں' بجائے 'کو' (یا اپنے تئیں کو) اور 'جانے ہارا' بجائے 'جانے والا' اور 'فرمانتا ہے' بجائے 'فرماتا ہے' اور 'جانتا ہے' بجائے 'جاتا ہے'۔

تیسرا دور[1]: اس مشاعرہ میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ زبان اردو ابتدا میں کچّا سونا تھی، ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک

---

[1]: اس دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں۔ مرزا جان جاناں مظہؔر، میر عبدالحیٔ تاباںؔ، سوؔداء، میر ضاحکؔ، میر دردؔ، میر سوزؔ، میر تقی میرؔ۔

صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج وافسر تیار ہوتے ہیں۔ اگر چہ بہت سے مرصع کار مینا نگار، پیچھے آئے مگر اس فخر کا نولکھا ہار انھیں بزرگوں کے گلے میں رہا۔ جب یہ باکمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے چوں کہ انھیں بھی نام وری تمغہ لینا تھا اس لیے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے۔ یہ گردوپیش کے میدانوں میں بہت دوڑے۔ سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتاریں گے۔ قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہوا ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا، اصل کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میرؔ صاحب اور خواجہ میر دردؔ کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سوداؔ کا کلام باوجود بلندیِ مضمون اور چستیِ بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔

اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رخ کیا۔ کاش آگے قدم بڑھاتے تا کہ حسن وعشق کے محدود صحن سے نکل جاتے، اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے، نہ عجائب ولطائف کا شمار ہے۔ اس بات کو بھولنا نہ چاہیے کہ خان آرزوؔ کے فیض صحبت نے ان نوجوانوں کے کمال کو اس طرح پرورش کیا جس طرح دایہ اپنے دامن میں ہونہار بچوں کو پالتی ہے۔ میں نے طبقہ دوم اور سوم کے اکثر استادوں کے حال مجمل طور پر حواشی میں لکھ دیے ہیں۔ اور اکثروں کے نام وکلام سے یہ جام خالی ہے۔ حقیقت میں ان سب کو زبان اردو کی اصلاح کا حق حاصل ہے لیکن اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں، سوداؔ، میرؔ، خواجہ میر دردؔ چار شخص تھے جنھوں نے زبان اردو کو خراط اتارا ہے۔

ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ طبقہ سوم کے اشخاص جو حقیقت میں عمارت اردو کے معمار ہیں انھوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دیے اور بہت سی فارسی

کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں انھیں گُھلایا پھر بھی بہ نسبت حال کے بہت سی باتیں ان کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں۔

چوتھا دور[1] قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں! ع۔ان کا آنا غضب کا آنا ہے، ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انھی کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے۔ کبھی طرّے سجائیں گے۔ کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گل بازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھالے گا۔ ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔

اس دور میں میاں رنگین سب سے نئے گل دستے بنا کر لائے اور اہلِ جلسہ کے سامنے سجائے۔ یعنی ریختہ میں سے ریختی نکالی۔ ہم ضرور کہتے ہیں کہ ہندوستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنی اصل پر رجوع کی لیکن چوں کہ پہلے کلام کی بنیاد اصلیت پر تھی اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے اس لیے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنؤ کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تخم ریزی دیوان رنگینؔ اور دیوان سید انشاؔ کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں۔ اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگینؔ کا ہے مگر سید انشاؔ نے بھی ان سے کچھ زیادہ ہی سگھڑاپا دکھایا ہے۔

ان صاحب کمالوں کے عہد میں صدہا باتیں، بزرگوں کی متروک ہو گئیں۔ البتہ شیخ مصحفیؔ کے بعض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بزرگوں کی میراث سے محبت زیادہ ہے۔ سید انشاؔء اور جرأت نے ان میں سے بہت کچھ چھوڑ دیا مگر نت، ٹک، انکھڑیاں، زور (یعنی بہت) بے تکلف بولتے ہیں اور وا چھڑے، بھلّہ رے، جھمکڑا، اجی، سید موصوف کا انداز خاص ہے۔

---

[1]: اس دور کے مشہور شعرا جرأتؔ، میر غلام حسنؔ، سید انشاؔ، مصحفیؔ، میاں رنگین ہیں۔

ہاں انھوں نے کلام کا انداز ایسا رکھا ہے کہ جو چاہتے ہیں سو کہہ جاتے ہیں۔ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا روزمرہ یہی ہے یا مسخرہ پن کرتے ہیں۔

پانچواں دور[1]: دیکھنا! وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں۔ اٹھو! اٹھو! استقبال کر کے لاؤ اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوں گے۔ اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے۔ پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گل دستے بنا بنا کر گل دانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برج آتش بازی کی طرح اس سے رتبہ عالی پائیں گے۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے۔ بالا خانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے مگر حق یہ ہے کہ شاعری ان کی ساحری (جادوگری) اور خود اپنے وقت کی سامری ہوں گے۔ ساتھ اس کے صاحب اقبال ایسے ہوں گے کہ انھیں پرستش کرنے والے بھی ویسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ ان بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں لیکن اتنا ہے کہ اب تک مضمون کا پھول اپنے حسن خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا۔ یہ اس کی پنکھڑیاں لیں گے اور ان پر موقلم سے ایسی نقاشی کریں گے کہ بے عینک کے نہ دکھائی دے گی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحب کمال اس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے جسے تم حسنِ خداداد سمجھتے ہو، کیوں کہ ان کی صنعت بے اس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی۔ پہلے بزرگ گرد و پیش کے باغوں کا پتّا پتّا کام میں لا چکے تھے۔ اب نئے پھول کہاں سے لاتے۔ آگے جانے کی سڑک نہ تھی اور سڑک نکالنے کے سامان نہ تھے۔ ناچار اس طرح استادی کا نقارہ بجایا اور ہم عصروں میں تاج افتخار پایا۔ یہ آخری دور کی مصیبت

---

[1] اس دور کے شعرا کے دو طبقے ہیں: طبقہ اول شاہ نصیؔر، ناسخؔ خلیقؔ، آتشؔ، مومنؔ، ذوقؔ، دیاشنکر نسیمؔ، غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ، طبقہ دوم: منیرؔ شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغؔ، جلالؔ، امیر اللہ تسلیمؔ وغیرہ۔

کچھ ہماری ہی زبان پر نہیں پڑی، فارسی کے متقدمین کو اس کے متاخرین سے مطابق کرلو۔ شعرائے جاہلیت کو متاخرین عرب سے مقابلہ کرلو۔ انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کے متاخرین بھی اس درد سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب تک عالم طفولیت میں رہتی ہے تب ہی تک شیر و شربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سالی ہوتی ہے تو خوشبو عرق اس میں ملاتی ہے۔ تکلف کے عطر ڈھونڈ کر لاتی ہے پھر سادگی اور شیریں ادائی تو خاک میں مل جاتی ہے۔ ہاں داؤں کے پیالے ہوتے ہیں جس کا جی چاہے پیا کرے۔

معنی اور اشارے:

نوروز	نیا دن، ایرانی سال نو کا نیا نام ہے جسے فارسیوں کا نیا سال بھی کہا جاتا ہے۔ کنایۃً شاعری کی شروعات
نفس ناطقہ	انسانی روح، بولنے والا وجود
دفعۃً	اچانک، یکا یک
حرارت برقی	بجلی کی گرمی
متانت	سنجیدگی
امراء	امیر کی جمع
شرفاء	شریف کی جمع
سیف	تلوار
کہن سال	بوڑھا، معمر
نجیب	بزرگ، معزز، شریف
فصیح زبان	فصاحت سے بات کرنے والا، خوش گفتار
ایہام	شاعری کی ایک صنعت جس کے ذریعہ شاعر شعر میں ایسے ذومعنی لفظ کا استعمال کرتا ہے جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے دوسرے بعید کے، شاعر کی مراد معنی بعید سے ہوتی ہے
ذومعنیین	دو معنوں والا، وہ بات جس میں کئی معنی اور پہلو نکلتے ہیں
دوہروں	دوہرا کی جمع، دوہے
سبزۂ خودرَو	اپنے آپ اگا ہوا، اُگی ہوئی گھاس

چترِ شاہی	بادشاہوں کے سر پر لگائے جانے والا بڑا چھاتا
اینچ پینچ	چکّر مکر وفریب، طرز ادا یا اسلوب بیان میں پیچیدگی جس سے اصل مفہوم کو سمجھنا دشوار ہو
عالم طفولیت	بچپن کا زمانہ، عہدِ طفلی، مراد ابتدائی دور
عام فہم	جو عام لوگوں کے سمجھ میں آ جائے، آسان، سہل
لطف انگیز	مزہ دینے والا، لذت بخش
سُبک	نازک، باریک، ہلکا
مبتذِل	حقیر، معمولی
حسن خداداد	قدرتی خوبصورتی، فطری حسن
فلاسفۂ سلف	اگلے زمانے کے فلسفی
گلشن فصاحت	خوش کلامی کے باغ، خوش بیانی کے باغ
قدرتی اِلحان	اصلی فطری ترنم، قدرتی خوش نوائی، سریلی آواز
فصاحت	خوش کلامی، خوش بیانی
بلاغت	فصیح کلام، جسب موقع گفتگو
کدورت	میل
مرصع کار	نگینے یا جڑاؤ جڑنے کا کام کرنے والا، خوبصورت نثر لکھنے والا
مینا کار	جڑاؤ کا کام کرنے والا، مرصع ساز
پرستش	پوجا
سامری	ایک یہودی جس نے حضرت موسیٰ کے زمانے میں سونے چاندی کا ایک بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اس کی پرستش کروائی تھی۔ مجازاً، جادوگر، ٹوٹکے باز

صنعت	پیشہ، ہنر، دستکاری، نکتہ آفرینی
بلندیِ مضمون	عالی مضمون
چستی بندش	ترتیب عبارت، عبارت کی ترکیب، الفاظ کی تراکیب وتراتیب
طلسم	جادو
وسعت	پھیلاؤ
عجائب	عجیب کی جمع، حیرت انگیز چیزیں
لطائف	لطیفہ کی جمع
مجمل طور پر	مختصر طور پر، اختصار کے ساتھ
حواشی	حاشیہ کی جمع، یادداشتیں جو کتاب کے حاشیے پر لکھی جاتی ہیں
خراط	لکڑی پر رندا کرنا، لکڑی کو خرادنا
معمار	عمارت بنانے والا، مراد بانی
طراریِ طبع	طبیعت کی تیزی، مزاج کی شوخی
ریختہ	اردو زبان کا ایک قدیم نام
ریختی	ایک ایسی صنف جو عورتوں کی زبان، عورتوں کے الفاظ، عورتوں کے لب ولہجہ اور عورتوں کی طرف سے خطاب کے انداز میں کہی گئی ہوں
رجوع	لوٹنا
تمسخر	ہنسی مذاق
تخم ریزی	بیج بونا، بیج ڈالنا
متروک	ترک کیا ہوا، چھوڑا ہوا

میراث	وراثت، ترکہ
آئین	دستورالعمل، قانون، اصول
طاق	یکتا، لاثانی
ایوان	محل
دُخّان	دھواں، بھاپ
ایجاد کرنا	نئی چیز پیدا کرنا
برج	گنبد
اوج	بلندی
خیال بندی	سلسلہ خیالات، خیالی تصویر، مضمون آفرینی، شاعری کی ایک خصوصیت جس میں کئی کئی شعروں میں ادا ہونے والے خیال کو ایک شعر میں بیان کر دیا جائے
نازک خیالی	نازک باتوں تک پہنچنے کا عمل، دقیقہ رسی، شعر میں ایسے خیالات نظم کرنا جن کا تعلق عقل سے زیادہ محسوسات سے ہو
صاحب اقبال	اقبال مند، خوش نصیب، خوش قسمت
ناچار	مجبوراً
مو	بال
متقدمین	متقدم کی جمع، اگلے زمانہ کے لوگ، سابقین
متاخرین	پیچھے آنے والے لوگ، اخیر زمانے والے
دورِ جاہلیت	ملک عرب میں ظہور اسلام کے قبل کا زمانہ

معروضی سوالات:

1۔ محمد حسین آزاد کہاں کے رہنے والے تھے؟

(i) دہلی (ii) لاہور

(iii) لکھنؤ (iv) رامپور

2۔ 'آب حیات' کس کی تصنیف ہے؟

(i) حالی (ii) شبلی

(iii) محمد حسین آزاد (iv) سرسید احمد خاں

3۔ آزاد نے آب حیات کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے؟

(i) چار (ii) پانچ

(iii) چھ (iv) تین

4۔ محمد حسین آزاد کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1905 (ii) 1900

(iii) 1915 (iv) 1910

مختصر ترین سوالات:

1۔ محمد حسین آزاد نے شاعری میں کس کی شاگردی اختیار کی؟

2۔ آب حیات کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ محمد حسین آزاد کی کسی چار کتابوں کے نام لکھئے

2۔ محمد حسین آزآد نے لاہور میں کس طرح کے مشاعرے کی بنیاد رکھی؟

تفصیلی سوالات:

۱۔ محمد حسین آزآد کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۲۔ محمد حسین آزآد کے اسلوب تحریر پر روشنی ڈالئے۔

۳۔ محمد حسین آزآد کی حالات زندگی مختصراً بیان کیجئے۔

(4)

خواجہ الطاف حسین حآلی

[پیدائش 1837ء، وفات 1914ء]

الطاف حسین نام، حآلی تخلص۔ 1837ء میں پانی پت کے محلّہ انصار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ بدقسمتی سے حآلی بچپن ہی میں ماں کی آغوشِ محبت سے محروم ہو گئے۔ جب نو برس کے ہوئے تو سر سے باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے بھائی بہنوں نے کی۔ رواج کے مطابق پہلے قرآن شریف بعد میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی شادی 17 ر سال کی عمر میں کر دی گئی۔ مگر انھوں نے کتب بینی اور مطالعے کے مشغلے کو جاری رکھا۔ ان کی علمی استعداد روز بروز ترقی کرتی گئی۔ مزید تعلیم کے لیے دہلی چلے آئے۔ یہاں ان کی ملاقات مرزا غالبؔ سے ہوئی اور وہ باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے فیض صحبت

حاصل ہوا۔ ان کی صحبت سے حالؔی کے خیالات میں بہت کچھ اثر پڑا، شیفتہؔ کی وفات کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ جہاں اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا کام سپرد ہوا، چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے واقفیت کا موقع ملا، اس وجہ سے حالی کی طبیعت پر مغربی خیالات کا کافی اثر پڑا۔ اردو کی پستی دیکھ کر اس کی شاعری اور انشاء پردازی کے نقائص پر اصلاح کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ حالؔی کو اس نئے انداز کے مشاعرے میں باریابی کا موقع ملا جس کی داغ بیل محمد حسین آزادؔ نے ڈالی تھی۔ لاہور کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی۔ چار سال کے قیام کے بعد وہ مجبوراً دہلی لوٹ آئے۔ یہاں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی جس سے ان کے خیالات اور فکر میں اہم تبدیلی پیدا ہوئی۔ انھیں کی مشورہ پر انھوں نے ایک شہرۂ آفاق نظم ''مدوجزر اسلام'' لکھی جس میں اسلام کے عروج و زوال کی داستان بیان ہوئی ہے۔ سرسید کی سفارش پر نظام گورنمنٹ کی طرف سے 75 روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔ 1904ء میں حکومت ہند کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد پانی پت میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ 1914 میں پانی پت میں ہی وفات پائی۔

حالؔی کی ادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، سوانح نگار اور صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز ہیں اور نثر کے فروغ میں حالؔی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حالؔی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ ''حیات سعدی'' اور ''حیات جاوید'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''یادگار غالبؔ'' حالؔی کے قلم سے لکھی گئی ایک اہم کتاب ہے، جسے غالبؔ شناسی کی سمت میں پہلا قدم کہنا چاہئے۔ اسلوب بیان اور واقعات کی چھان بین کی وجہ سے ان کتابوں کی بدولت حالؔی کو بہترین انشاء پرداز شمار کیا جاتا ہے۔ حالؔی کی سب سے اہم تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ یہ ان کے دیوان کا مقدمہ ہے، جسے ایک مستقل کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف زبانوں کے ادبی خیالات کی روشنی میں فن شعر پر تفصیلی بحث کی ہے اور اصولِ تنقید پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حالؔی شاعری کی افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے۔ اس کے پہلے حصے میں حالؔی نے شاعری کے شرائط اور خوبیاں بیان کی ہیں۔ جب کہ دوسرے حصے میں مختلف شعری اصناف کا صراحت کے ساتھ تنقیدی

جائزہ لیا ہے۔

حالؔی کی نثر سادہ، سہل اور رواں ہونے کے ساتھ توانا اور پُر تاثیر ہے۔ ان کی زبان نہایت پاکیزہ اور دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ انھوں نے عبارت آرائی اور رنگینی سے یکسر گریز کیا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں تناسب اور موزونیت ہے۔ محاورات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ عبارت مسلسل اور مربوط ہوتی ہے۔ ان کے یہاں نہ نذیر احمد کا زورِ بیان ہے اور نہ آزاؔد کی شگفتگی و لطافت، باوجود اس کے ان کی نثر میں ایک خاص طرح کی دلکشی پائی جاتی ہے۔

مولانا حالؔی اردو کے ایک بڑے محسن ہیں۔ ویسے تو اردو میں بہت سے اسالیب بیان پائے جاتے ہیں مگر جو اسلوب سب سے زیادہ مروج اور مقبول ہوا وہ حالی کا ہی اسلوب ہے۔

حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی مولانا حالؔی کی گراں قدر تصانیف ہیں جنھوں نے اردو ادب میں سوانح نگاری کو فن کی صورت بخشی۔ ان تصانیف کے علاوہ مقدمہ شعر و شاعری سے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ یہ اقتباس اسی کتاب سے منتخب کیا گیا ہے۔

غزل کی اصلاح

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔قوم کے لکھے پڑھے اوران پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد وسماع کی مجلسوں میں لہوولعب کی صحبتوں میں، تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہیں،اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں، جولوگ کتاب کے مطالعے سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہوسکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہوجاتا ہے۔ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر وسائر اور مرغوب خاص وعام ہواس کا اثر قومی مذاق اور قوی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔اسی لیے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔غزل میں جو عام دل فریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے، جو کان ٹپّے ٹھمری سے مانوس ہوجاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی، بوالہوسی اور کام جوئی کی باتوں میں جو مزہ ہے وہ خالص عشق ومحبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا، اوباش والواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارہ ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے جن مذاقوں پر ہزل ومطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا، جو لوگ سرمہ، کاجل، کنگھی، چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں۔لیکن زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ رہے گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدیؔ، رومیؔ، خسرؔو، حافظؔ، عراقیؔ، مغربیؔ، احمد جامؔ اور جامیؔ وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا، ہم نے حیات سعدیؔ میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے، ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور تھے، ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے، وہ خال وخط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا اور مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں، وہ رندی، بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق ملمع اور زاہدوں کی زہدریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکرو ریا سے، کوئی حماقت غرور مال و جاہ سے، کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی، جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم، طمّاع، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریا کار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے، وہ اہل اللہ اور ارباب صدق وصفا کو نفس امّارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقے میں کم وبیش ہوتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ

رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت وسخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقے پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

ا۔غزل کے لیے ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق ومحبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا۔لیکن اصل اور نقل میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی، جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہوسکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہوسکتا، پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا وہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا وہوس اور شاہد بازی وکام جوئی پر موقوف نہیں ہے، بندے کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، خاوند کو بیوی کے ساتھ، بیوی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکیں کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل

بستگی ہوسکتی ہے۔ پس جب کہ عشق ومحبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جب کہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتہ بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سرِّ مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع واقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں، اور جہاں تک ہوسکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ، چیرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ خط، مسیں بھیگنا، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، تر سا بچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو محض روحانی یا عشق الٰہی پر محمول ہوسکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے۔ کیا فارسی اور کیا اردو دونوں زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں، پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالا یطاق سمجھا جائے۔

۲۔ جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے نیچر میں داخل ہیں اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہا وزہّاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن وتعریض کرنی اپنی مے خواری وتوبہ شکنی وخرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال واقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل وشرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدیؔ ورومیؔ وحافظؔ وخسروؔ وغیرہم۔ چوں کہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی بہتات

سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مقبول ومشہور ہوئی۔ اس لیے متاخرین نے بھی ان کی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کرلیا۔مگر ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں، ایک اہل باطن کے، دوسرے اہل رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔قتل کئے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے قیدیں بھگتی ہیں، جلا وطن کیے گئے ہیں، کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے، بقول شخصے، ''کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان'' فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے، انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں، انھوں نے کہا شراب خواری وقمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف باتیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گم راہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے، انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب وساقی و جام صراحی اور ان کے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجازاً اور استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں یہ لوگ (یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن جو رہ زن طریقت ہے، اس سے محفوظ رہیں، یا اس لیے کہ عشق محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب نکلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوش گوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں) روحانی کیفیات کو شراب وشاہد کے پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن

سے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اس لیے مولانا روؔم فرماتے ہیں:

خوش تر آن باشد کہ سر دلبران

گفتہ آید در حدیث دیگران

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گزرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا، اس کو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چوں کہ شاعری کا جزو اعظم (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے، اس لیے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرائے میں بطور مجاز و استعارے کے ادا کر سکتے ہوں، ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے، جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو لتاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہ ہونے کسی قسم کی مخالفت کے، صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں، یعنی نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا، کیوں کہ رذائل کی برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اس کے دل نشیں نہیں کی جا سکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرائے میں ظاہر کیا جائے۔ ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کی جائے اور نامردی یا بہادری کی تصویر یوں ہی دکھائی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے، لیکن اس صورت میں ضرور ہے کہ واعظ اور زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابل الزام ہو کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اس لیے کہ وہ قابل الزام ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے، یہاں بہ طور مثال کے ہم شیخ ابراہیم ذوؔق کے دو شعر لکھتے ہیں:

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں لہٰذا اس طرز بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں:

ذوقؔ زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گل رنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ، شیخ ہے نہیں جتلایا گیا کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہہ کر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافت طبع کی جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدیؔ اور سوزنیؔ کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

۳۔ مذکورۂ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت، یا صبر یا رضا یا قناعت یا توکل یا رغبت یا نفرت یا رحم یا انصاف یا غصہ یا تعجب، یا امید، یا ناامیدی، یا شوق، یا انتظار، یا حب وطنی یا قومی ہمدردی، یا رجوع الی اللہ، یا حمایت دین و مذہب، یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال، یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعے میں بیان ہو سکتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں، نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آرگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیے ہاتھ پانوں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو، لیکن ہمارے دل

میں اس خیال کی حقارت ہو یا انھوں نے اس کے برعکس پانوں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو، دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو محض بے سود ولا حاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں، وہی منکشف ہوں گے، بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا۔ کیوں کہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہوسکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرائے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلا شبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی، لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مسالہ موجود ہے جو صدیوں تک نبڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے کہ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ کسی واقعے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ

کیا ہوا؟ کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ میٹریل غزل کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا، عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کا لنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا، اب جوگیئے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روداد، وطن کی دل بستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہوسکتی ہیں۔

معنی اور اشارے:

اصلاح	درستی، ترمیم، تصحیح
وجد وسماع	بے خودی، سرمستی جوش مجازاً حالت ذوق وشوق جوصوفیانِ سماع پسند پر وارد ہوتی ہے۔
لہوولعب	کھیل کود، سیر وتفریح
دائر	چلنے والا، دورہ کرنے والا، زیرِ تجویز
سائر	پھرنے والا
مرغوب	پسندیدہ
دل فریبی	خوبصورتی
ٹھمری	ایک قسم کا گیت، ہندی شاعری کی ایک بحر
مانوس	خوگر، مائل
دھرپت	ایک ہندی راگ
بوالہوسی	فحاشی، اخلاق شکنی
کام جوئی	مقصد کو پانا
اوباش	بدمعاش، بدچلن
ہزل	بے ہودہ بات، مذاق
مطائبہ	خوش طبعی کی باتیں، مذاق
اہل اللہ	اللہ والے، بزرگانِ دین
صاحب باطن	عارف، صوفی، اللہ والے

اعتناء	توجہ
روحانیت	روحانی خاصیت، باطنی خاصیت، روحانیت سے مراد مذہبی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ انسانی عبادت وریاضت کے ذریعہ پاکیزگی وطہارت کی اس منزل پر پہنچ جائے جہاں اس کے ظاہر کے ساتھ باطن بھی منور ہو جائے۔
بے ثباتی	ناپائیداری
خال وخط	جسمانی ساخت، بناوٹ
شاہد پرستی	حسینوں سے رغبت، حسن پرستی
ترغیب	شوق، خواہش
دنیا پرستی	دنیاداری، دنیا کی حرص وہوس میں مبتلا ہونا۔
دلق	گدڑی
خود پرستی	خود پسندی، خودشناسی، غرور، تکبر
حُب دنیا	دنیا سے لگاؤ، دنیا سے محبت
بادۂ نخوت	غرور کا نشہ
طمّاع	بہت لالچی
حریص	لالچی
بخیل	کنجوس
قلعی کھولنا	بھید کھولنا، حقیقت معلوم ہونا، اصلیت ظاہر کرنا
دام تزویر	مکروفریب کا جال
ارباب صدق وصفا	سچائی اور خلوص والے

نفس امارہ	وہ نفس جو برائی پر ابھارتا ہے
خیانت	بد دیانتی، دھوکہ
متنبہ	آگاہ، خبر دار
رکاکت	سفلہ پن، کمینگی
یوماً فیوماً	روز بروز
تعشق	چاہ، عشق، اشتیاق، تمنا
تکذیب	جھٹلانا
شاہد بازی	حسینوں سے صحبت رکھنا، حسن پرستی
ہوا پرستی	موقع پرستی، عیش پرستی، بدکاری
بہتان	الزام، تہمت
جامعیت	ہمہ گیری
سرِّ مکتوم	پوشیدہ راز، مخفی راز
کم ظرفی	کمینہ پن
کلاہ	ٹوپی
چیرہ	عورت کی دوشیزگی
سبزۂ خط	مرد کے چہرے پر شباب کی علامت، ڈاڑھی مونچھوں کا آغاز
مسیں بھِگنا	سبزہ آغاز ہونا، مونچھوں کی علامت، جوانی کی ابتدا ہونا
مغبچہ	مے فروش کا لڑکا، وہ خوبصورت لڑکا جو شراب خانے میں شراب پلانے پر مامور ہو
ترسا بچہ	عیسائی کا بچہ، مجازاً حسین بچہ

موباف	وہ فیتا جو عورتیں چوٹی میں ڈال کر گوندھتی ہیں۔
آرسی	آئینہ
مالا یطاق	جو طاقت سے بڑھ کر ہو، وہ کام جس کے کرنے کی طاقت نہ ہو
فقہا	فقیہ کی جمع، شرعی احکام اور مسائل کے علم کا جانکار
زُہّاد	زاہد کی جمع، متقی پرہیزگار، پارسا
طعن و تعریض	طنز، اعتراض، نکتہ چینی، لعنت ملامت
غیر منفک	جسے جدا نہ کیا جا سکے، الگ نہ کیا جا سکے
متصوفین	تصوف کا راستہ اختیار کرنے والے، صوفیا، اہلِ طریقت
بہتات	کثرت، زیادتی
متاخرین	اخیر زمانے کے لوگ
تقلید	پیروی، کسی کے نقشِ قدم پر چلنا
شیوہ	طریقہ
اہلِ رائے	دانشمند لوگ
مُشکیں باندھنا	کسی کے دونوں بازوؤں کو پُشت کی جانب رسی وغیرہ سے باندھنا تا کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ مجبور کرنا
قُمار بازی	جوا کھیلنا
اکبر الکبائر	گناہِ کبیرہ
گندم نمائی	فریب، دغابازی
خُردگیری	عیب جوئی کرنا، نکتہ چینی کرنا

تعریضات	تعریض کی جمع، کنایہ سے بات کرنا
مطارحات	باہمی گفتگو، مشورے
حسن ظن	اچھا گمان
رہزن	ڈاکو
طریقت	صوفیوں کا طریقہ جس سے روحانی کمال حاصل ہوتا ہے
حریف	مدمقابل، دشمن، رقیب
زجر	ڈانٹ، ڈپ، دھمکی، تنبیہ
سالوس	مکاری، عیاری
رذائل	برائیاں
معقولات	معقول کی جمع، علوم حکمت وفلسفہ ومنطق
خصلت	عادت
اعادہ	دوہرانا
دقائق	کسی بات کے محاسن ومعائب کے وہ پہلو جو غور وفکر سے سمجھ میں آئیں، اسرار ورموز، باریکیاں
غوامض	غامض کی جمع، باریکیاں، گہری باتیں، دقیق معنی
منکشف	ظاہر

معروضی سوالات:

1۔ حالؔی کہاں کے رہنے والے تھے؟

(i) دہلی (ii) پانی پت

(iii) سونی پت (iv) لاہور

2۔ حالؔی نے کس سے فیض صحبت حاصل کی؟

(i) مرزا غالبؔ (ii) شیفتہؔ

(iii) دونوں سے (iv) صرف مرزا غالبؔ سے

3۔ ''مدوجزر اسلام'' کس کی شہرۂ آفاق نظم ہے؟

(i) حالؔی (ii) آزادؔ

(iii) اکبرالہ آبادی (iv) اسمٰعیل میرٹھی

4۔ حالؔی کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1904 (ii) 1910

(iii) 1914 (iv) 1912

5۔ ''حیات جاوید'' کس کی سوانح عمری ہے؟

(i) سرسید (ii) مرزا غالبؔ

(iii) شیخ سعدی (iv) مولانا روم

6۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' کس کی تصنیف ہے؟

(i) شبلیؔ (ii) محمد حسین آزاد

(iii) نذیر احمد (iv) حالؔی

مختصرترین سوالات:

1۔ حالیؔ کی کسی تین کتابوں کا نام لکھئے۔

2۔ حالیؔ نے مقدمہ شعروشاعری میں کس چیز سے بحث کی ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ حالیؔ کی نظر میں غزل کی اصلاح سب سے زیادہ اہم اور کیوں ضروری ہے؟

2۔ حالیؔ کے نزدیک غزل میں کس طرح کے مضامین بیان کئے جاسکتے ہیں۔

تفصیلی سوالات:

1۔ حالیؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

2۔ حالیؔ کے اسلوب تحریر پر روشنی ڈالئے۔

3۔ حالیؔ کی حالات زندگی مختصراً بیان کیجئے۔

(5)

علّامہ راشدالخیری

[پیدائش 1868ء، وفات 1936ء]

علّامہ راشدالخیری کا اصل نام محمد عبدالراشد تھا۔ وہ دلّی کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے میں 1868ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام حافظ عبدالواحد اور والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ اُن کی والدہ کو سسرال میں رشیدالزمانی کا لقب دیا گیا تھا۔ راشدالخیری نے اپنی دادی سے قرآن پڑھنا سیکھا۔ اس کے بعد اُن کا داخلہ دلّی کے عربک اسکول میں ہو گیا جہاں انھیں مولانا الطاف حسین حاؔلی جیسے استاد سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ڈپٹی نذیر احمد اُن کے پھوپھا تھے۔ انھوں نے بھی اپنی نگرانی میں انھیں پڑھایا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1891ء میں محکمۂ بندوبست اُنّاو میں انھیں ملازمت مل گئی۔ اُن کا تبادلہ مین پوری، علی گڑھ، دہرہ ڈون وغیرہ میں ہوتا رہا۔ آخر میں ان کا تبادلہ دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں ہوا۔

راشدالخیری ایک آزادطبع انسان تھےاور ملازمت کی پابندی اُن کے مزاج کے خلاف تھی۔لہٰذا انھوں نے 1910ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیااور علم وادب کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔اُن کی پہلی مطبوعہ تصنیف 'صالحات' ہے۔

راشدالخیری ایک ممتاز ادیب تھے۔انھوں نے شاعری بھی کی اور افسانے اور ناول بھی لکھے۔اُن کی تحریروں میں اصلاحی انداز پایا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں طبقۂ نسواں کو خاص طور سے موضوع بنایا اور عورتوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم،اُن کی پس ماندگی اور سماجی الجھنوں کو پراثر انداز میں بیان کیا جس کی وجہ سے انھیں مصوّرِ غم کے خطاب سے نوازا گیا۔راشدالخیری مشرقی تہذیب کے دل دادہ تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے تاعمر اس کی وکالت کرتے رہے۔نئی تہذیب کی خامیوں اور برائیوں کو اُجاگر کر کے اپنی روایتی تہذیب سے وابستہ رہنے کی طرف توجہ دلاتے رہے۔

علاّمہ راشدالخیری نے کثیر تعداد میں تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں،جن میں احکام نسواں،آفتابِ دمشق،آمنہ کا لال،عالمِ نسواں،الزہرا،فسانۂ سعید،گلدستہ عید،طوفان حیات،نشیب وفراز،محبوبۂ خداوند،نوحۂ زندگی،شبِ زندگی، شامِ زندگی،صبحِ زندگی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔شامل نصاب سبق ان کی مشہور تصنیف سیدہ کا لال سے ماخوذ ہے۔

علامہ راشدالخیری کی وفات 1936ء میں دلّی میں ہوئی۔

کربلا کا ننھا شہید

(یہ اقتباس مصوّرِ غم مولانا راشد الخیری کی کتاب ''سیدہ کا لال'' سے ماخوذ ہے۔ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے۔ان میں ناول بھی ہیں اور مضامین کے مجموعے بھی۔ صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، نوحۂ زندگی، گردابِ حیات، چراغِ سحری، عروسِ مشرق، طوفانِ حیات اور قطراتِ اشک وغیرہ خاص طور سے قابلِ قدر ہیں۔

اس مضمون میں جو کردار آئے ہیں طلبہ کی سہولت کے خیال سے ان کی تشریح کر دی جاتی ہے۔)

۱۔حضرت فاطمہؓ۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی صاحب زادی اور حضرت علیؓ کی بیوی۔

۲۔حضرت امام حسینؓ۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے لختِ جگر۔

۳۔حضرت زین العابدینؓ۔ (عابد بیمار) حضرت امام حسینؓ کے منجھلے صاحب زادے۔

۴۔حضرت علی اصغرؓ۔ حضرت امام حسینؓ کے شیر خوار فرزند۔

۵۔بی بی شہر بانوؓ۔ حضرت امام حسین کی بیوی۔

۶۔بی بی زینبؓ۔ حضرت امام حسینؓ کی حقیقی بہن۔

۷۔ عمرو بن سعد۔ یزیدی لشکر کا سپہ سالار فوج۔

کس قدر قیامت خیز تھی وہ ساعت جب فاطمہؓ کے لختِ جگر نے ہاتھ بڑھائے اور شہر بانو نے اپنے کلیجے کا ٹکڑا جس کا منکا ڈھل چکا تھا، جس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں جس کے ہاتھ پاؤں صرف سانسوں کی گود میں تھے یہ کہہ کر شوہر کو دیا۔ ''ابن علیؓ اپنا معصوم خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ ہوا گرم ہے لو کے تھپیڑے میرے بچے کو جھلسا نہ دیں۔ عبا اڑھا لیجئے اور کلیجے سے لگا لیجئے۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں پانی سے پہلے ہی میرا چاند گہنا نہ جائے۔ ہوا کے گرم جھونکے اس پھول کو کملا نہ دیں۔ابن

اسداللہ! سے دعا کیجئے کہ عمر وسعدؔ کا پتھر دل پگھل جائے اور وہ میرے لال کو چند قطرے پانی کے دیدے۔آپ بسم اللہ کیجئے ایک عمر وسعدؔ نہیں تو نہ سہی، اس کے لشکر میں بہت سے صاحب اولاد ایسے ہوں گے جن کی گودیں بھری پڑی ہوں گی، جو بچوں کے باپ ہوں گے میرا بچہ ان کو دکھا کر ان کو اپنے بچے یاد دلائیے گا۔ان کے دل تڑپ اٹھیں گے اور وہ رو رو کر میرے اصغر کو پانی پلائیں گے۔جلدی کیجئے، میں نے غلطی کی کہ اس قدر دیر میں خیال آیا۔ہاں ابن اسداللہ میں بھول گئی۔ عمر وسعدؔ بھی تو بچوں والا ہے۔اس کو عداوت آپ سے ہے میرے اصغر نے اس کا کیا بگاڑا؟ اس سے کہئے کہ میرا بچہ بیعت نہیں سمجھتا۔ پیاس نے اس کا ننھا سا کلیجا بھون دیا۔اس کو دکھا دیجیے کہ دو دن میں اس کا چہرہ اتر گیا۔زبان خشک ہوگئی ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ گئیں۔اس سے کہئے کہ اس کے دادا علیؓ اور اس کی دادی فاطمہؓ کی مقدس روحیں پوتے کی پیاس پر بلبلا رہی ہیں۔ پانی ہم کو نہ دے، ہمارے خیمے میں نہ آنے دے، اپنے ہاتھ سے زیادہ نہیں، ایک گھونٹ، چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دے۔اس کی کیفیت سنا، میری امانت عمر وسعد تک پہنچا دیجیے اور میرا بچہ یہ کہہ کر اس کی گود میں دے دیجئے کہ شہر بانو کی امانت تجھ کو دیتا ہوں۔تو مسلمان ہے اور یہ امانت اس باپ کا بچہ ہے جس کے نانا پر تیرے باپ اور دادا ایمان لائے اور جس کا کلمہ تو پڑھ رہا ہے۔

دنیا اس واقعہ پر، آسمان اس منظر پر اور زمین اس کیفیت پر جب بھی اور اب بھی روئی اور روئے گی۔امام حسینؓ نے بچہ کو لے کر چلنے کا قصد کیا تو دوسرا قدم ایک سر پر پڑا جو ردا میں لپٹا ہوا امام کے پاؤں پر رکھا تھا، سر اٹھایا تو دیکھا کہ ماں جائی بہن زینبؓ بنت علیؓ پاؤں پر پڑی ہے۔بے تاب ہو کر فرمایا۔

زینبؓ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ میری وجہ سے تجھ پر اور تیرے پیاروں پر مصیبت آئے گی اور تیری ماں حسینؓ کو اس لیے پال رہی ہے کہ اس کی وجہ سے زینبؓ اور اس کے بچّوں کو یہ وقت دیکھنا پڑے گا۔قیامت کے روز تیری ماں اور باپ دونوں میری بے گناہی کی گواہی کی آوازیں دیں گے۔جب خیال آتا ہے کہ تیرے بچے تین دن تک پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستے ہوئے رخصت ہوئے تو کلیجہ کٹ جاتا ہے۔بی بی زینبؓ کی چیخ سے خیمہ گونج اٹھا وہ پھر قدموں پر گریں اور کہا۔

”قربان جاؤں اس صورت کے جو ماں اور باپ دونوں کی صورتیں یاد دلا رہی ہیں۔بھیّا! کیا کہہ رہے ہو؟

زینبؓ کا دل خود ہی زخمی ہے اس زخم پر نمک نہ چھڑکو۔ عونؓ ومحمدؓ کو اصغر پر قربان کئے، زینبؓ اور اس کا تمام گھر اس پر نثار۔ خوش نصیب ہوں کہ زندگی کی آخری گھڑیاں ان قدموں میں گزریں اور موقع ملا کہ ماں کے دودھ کا اثر عمر وسعد کو دکھادوں اور ان جفا کاروں کو بتادوں کہ خاندانِ رسالتؐ کی عورتیں کس بے جگری سے میدان میں آتی ہیں اور ماں باپ کی امانت پر اپنے بچے قربان کرتی ہیں۔ حسینؓ میدانِ کربلا میں زینب سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں جس کو ماں سے سرخرو ہونے کا موقع ملا۔

بھیا! میں کچھ اور عرض کرتی ہوں۔ شہر بانو ناتجربہ کار ہیں اور ان کو عرب کا حال معلوم نہیں۔ بنوامیّہ اور بنو فاطمہؓ کے تعلقات کی ان کو کیا خبر؟ سیدھی سادھی بیگم ان کھڑ پنچیوں کا حال کیا جانے۔ یہ کیا سمجھے کہ عمر وسعد آل رسولؐ کے بچہ بچہ کا دشمن اور خون کا پیاسا ہے۔ بھیّا! میرا دل دھڑک رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں سنسنیاں آ رہی ہیں۔ لِللّٰہ حسینؓ میرے بچہ کو دشمنوں میں نہ لے جائیں۔ بلائیں دور ہوں اس چاند سے مکھڑے کی، مجھے ڈر ہے کہیں ظالم اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ دل کو اتنی دیر سے سنبھال رہی ہوں اور کہتی ہوں لاکھ سنگ دل ہوں مگر اولاد والے ہیں معصوم پر ہاتھ نہ اٹھے گا۔ لیکن دل نہیں مانتا اور یہی ڈر لگتا ہے کہ اس کی جان سے دور بے ایمان کوئی گل نہ کھلا دیں۔ میری پیاری بھاوج، خدا تیری مامتا ٹھنڈی رکھے اور اصغر کی ہزاری عمر ہو، مگر ہائے کیا کروں دل نہیں مانتا۔

اتنا کہہ کر بی بی زینبؓ بچہ کے چاروں طرف پھریں اور کہا ''جانتی ہوں موت سر پر آ گئی ہے، مگر اس کی آئی مجھ کو آئے۔ ہائے میں زندہ رہوں اور اصغرؓ ظالموں کے پھندے میں پھنسے۔ بی بی تمھاری ضدّ ہے بھیجو۔ بھیّا! میرا بچہ میری گود میں دو، اس کو رخصت کروں۔ بی بی زینبؓ نے پڑھ پڑھ کر بچہ پر پھونکا۔ اور اس کے ننھے ہاتھ سر آنکھوں سے لگائے اور رو رو کر کہا۔ ''اچھا لے جایئے۔''

بچہ کو گود میں دیکھ کر عمر وسعدؔ نے قہقہہ لگایا اور لوگوں سے کہا ''حسینؓ کوئی مشکیزہ لا رہے ہیں، پانی بھر دو۔ مگر مزا جب ہے کہ پانی کے ساتھ ہی مشک اور حسینؓ دونوں چھلنی ہو جائیں اور حسینؓ پانی کو ترستا ہوا دنیا سے اٹھے۔ دیکھو پورا انتظام کرو۔ ایک قطرہ پانی کا حلق میں نہ پہنچے۔ جس وقت ہوا آگ کے شعلوں میں نہا رہی تھی، جب کربلا کا میدان زمین

وآسمان سے انگارے اگل رہا تھا، اس وقت صبر ورضا کا ایک مجسّم نمونہ عمر وسعد کے سامنے اس گھوڑے پر سوار تھا جس کی زبان پیاس کے مارے باہر نکل آئی تھی اور حسرت ویاس سے مڑ مڑ کر اپنے سوار کے قدموں میں آنکھیں مل رہا تھا۔ رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے مسلمان آئیں، قدرت کا تماشا دیکھیں، روئیں اور چلائیں، چیخیں اور پیٹیں۔ اس گھوڑے کا سوار وہ سوار ہے جوان کے مولا اور آقا کے کندھوں پر سوار ہوا۔ یہ دھوپ میں جلنے اور جھلسنے والا انسان بنتِ رسولؐ کا دودھ پی کر اور علی بن ابی طالب کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوا ہے۔ یہ زبان جو آج خشک ہے اور جس میں کانٹے پڑ چکے ہیں، اس کو خاتم النبیّینؐ نے بوسے دیے ہیں۔ انسانیت رو رہی ہے، عقیدت سر پٹک رہی ہے اور مروت منہ پیٹتی ہے جب دیکھتی ہے کہ حسینؓ بن علیؓ نے عباؑ کا دامن اٹھایا اور معصوم اصغر کا پسینہ پونچھ کر فرمایا۔

''حاشا اور کلاّ عمر وسعد تین روز کا کیا اگر تین مہینے اسی طرح گذر جاتے پانی اور دانہ اڑ کر منہ میں نہ جاتا۔ آگ اس جسم کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی اور گرمی کے شرارے جسد خاکی پھونک دیتے مگر تیری طرف رخ نہ کرتا اور تجھ سے بات نہ کرتا لیکن جس نام کا کفش بردار ہوں، جس کی لگن دل کو لگی ہوئی ہے جو جان وایمان ہے اس کی بشریت پر بھی قرآن شاہد ہے۔ اس لیے عمر وسعد ماتا کے درد سے مجبور ہو کر تجھ کو انسان نہیں، صاحب اولاد سمجھ کر شہر بانو نے اس معصوم کو تیرے پاس بھیجا ہے۔ دیکھ اس کی زبان ہونٹوں سے باہر آ گئی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور اس کا حلق خشک ہے۔ دنیا کی عیش اور زندگی کی بہار تجھ کو اور تیرے ساتھ یزید اور ابن زیاد کو مبارک ہو۔ مگر یہ کلیجے کا ٹکڑا اس دنیا میں تھوڑی دیر کا مہمان ہے دیکھ عمر وسعد دیکھ! اس کے سانس کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ مجھ کو نہیں اصغر کو اس کی معصومیت کو دیکھ کر زیادہ نہیں پانی کے چند قطرے پلا دے۔ تاریخ تیرے اس عمل پر فخر کرے گی۔ اور میرے نانا کی امت تیرے اس فعل کو نیکی سے یاد کرے گی اور اس کا پھول سا چہرہ اور یہ نازک جسم لو کے تھپیڑوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جلدی کر اور اپنے ہاتھ سے میرے معصوم کے حلق میں پانی کے دو قطرے ٹپکا دے۔ دیکھ ان ہونٹوں کو جو خشک ہیں اس زبان کو سوکھ گئی اور اس صورت کو جو مرجھا رہی ہے آگے بڑھ اور انسان بن اور انسانیت کو بٹّہ نہ لگا۔

یزیدی لشکر کی بیس ہزار آنکھوں میں ایک آنکھ بھی سرمۂ انسانیت سے مزین نہ نکلی۔ ان کے قلب کی سیاہی چہروں

تک پہنچ چکی تھی۔ انسان نہیں جانور۔ جانور نہیں پتھر تھے کہ دودھ کو ترستے اور پانی کو پھڑکتے معصوم کی اس کیفیت کا ممتا کی ماری ماں کے پیام اور باپ کی التجا کا استقبال قہقہوں سے کیا۔ کیسا نازک وقت ہے کہ اس ہولناک میدان میں آفتاب آتشِ بار کے سائے میں کھڑے ہونے والا انسان اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد عمر وسعد کے اس حکم سے گونجتا ہے۔ ''حسین کا بچہ میدان سے زندہ نہ جانے پائے''۔

ہوا لرز رہی تھی اور پہاڑ تھرّا رہے تھے۔ جب امام حسینؑ نے یہ الفاظ سن کر اپنے چاند کو دامن سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور کلیجا دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ ابن کاہل حرملہ کا تیر معصوم گلے کو چھیدتا ہوا امام کے بازو میں جا گھُسا۔

قیامت کی مصیبت اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ اس معصوم نے، جس کے حلق کے آر پار تیر گھسا ہوا ہے۔ باپ کی گود کو اپنے خون سے شرابور کر رہا ہے آنکھ کھلی اور باپ کو سوکھی زبان دکھا کر ہمیشہ کے واسطے بند کر لی۔

چکّر آیا، پاؤں کانپ گئے جس وقت علی اصغر نے باپ کی گود میں آخری سکی لی۔ حسینؑ بن علیؑ کا مہمان دم توڑ رہا تھا۔ بچّہ کوز میں پر لٹا کر اپنے ہاتھ سے تیر نکالا اور بچے کو سینہ سے لگا کر خیمہ کا رخ کیا۔ دونوں نند بھاوج دروازے میں کھڑی تھیں۔ امام حسینؑ کو لہولہان دیکھ کر دل ہوا ہو گیا۔ زینبؑ چکرا کر گریں اور شہر بانو یہ کہہ کر آگے بڑھیں۔ ''ہائے یہ کیا ہوا''؟

امام حسینؑ نے بچے کی لاش بیوی کی گود میں دی اور زینبؑ کو اٹھا کر کہا۔

''لے بہن تیرا لال حوضِ کوثر کے قطروں سے سیراب ہو گیا۔''

خیمے میں کہرام مچ گیا۔ بی بی زینبؑ نے حضرت شہر بانو سے کہا ''بھاوج، ڈیڑھ سال کی کمائی کربلا کے میدان میں لٹا دی۔ میرے بچے کو میرے مہمان کو تم نے بھوکا پیاسا گھر سے نکالا۔ شہر بانو اس کی خدمت تم کو وبال ہو گئی۔ ہائے کس پیار سے ہمک کر میری گود میں آیا اور کیسی حسرت سے آخری نظر مجھ پر ڈالی۔ ارے نہیں، شہر بانو نہیں، اس کو نکالنے والی، اس کو مارنے والی پھوپھی میں ہوں۔ بھائی کی گود میں میں نے دیا، پانی کو میں نے بھیجا۔ ارے خدا کے لیے بتاؤ، میرے قصور کی کیا سزا ہے۔ اماں اور نانا کو حشر میں کیا منہ دکھاؤں گی۔ جب وہ کہیں گے، اصغر کو شہادت کے واسطے تو نے بھیجا۔ لاؤ میرے بچے کو میری گود میں دو، شہر بانو اپنے بچے کی قمیص بدلوں یہ خون میں لتھڑی ہوئی قمیض مجھے دو، اس پر قربان ہو

جاؤں۔ بھائی کے ہاتھ کانپیں گے، مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہے کس دل سے اصغر کو قبر میں رکھیں گے۔ اے کربلا! تیری گود میں آج میری گود میں کھیلنے والا آتا ہے۔ جو میرے سینے پر لوٹتا تھا، جو ہمیشہ شہر بانو کے ہاتھوں میں سوتا تھا، وہ آج تیری گود میں سوئے گا۔

بھائی! میرے مہمان کی صورت ایک دفعہ اور دیکھ لو۔ یہ صورت آنکھ سے اوجھل ہوتی ہے اور اصغرؓ ہمیشہ ہمیشہ کو جاتے ہیں۔ بیٹا، پھوپھی کا قصور معاف کردینا۔ دادا اور دادی سے میری شکایت نہ کرنا کہ پیاسا گھر سے نکالا۔ تم چلو میں بھی آتی ہوں۔ رات کو اگر دشمن نے فرصت دی تو قبر پر آکر لپٹوں گی، چمٹوں گی، آج تک میری اور شہر بانو کی گود تھی اب دادا اور دادی کے پاس جاؤ، خدا حافظ و نگہبان ہے۔

کس دل سے امامؑ عالی مقام نے علی اصغرؓ کو دفن کیا، اس کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ قصد کیا کہ سیدھے میدان جنگ میں پہنچ کر اصغرؓ کے خون کا بدلہ لیں مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ ناموسِ رسولؐ خدا کے سپرد کروں اور یہ دم جو باقی رہے ہیں آخری مرتبہ ان کو اور دیکھ لوں، خیمہ میں داخل ہوئے تو خون اب بھی بازو سے بہہ رہا تھا۔ کپڑے خونم خون تھے۔ بیوی اور بہن کو معصوم اصغرؓ کے صدمہ سے ابھی تک یہ خبر بھی نہ تھی کہ بچہ کے ساتھ باپ کے بازو سے بھی فوارہ چُھٹ رہا ہے۔ سب سے پہلے زینبؓ کی نظر امام حسینؓ کے خون پر پڑی ہائے بھائی کہہ کر لپٹ گئیں اور بدحواسی سے چیخ کر کہا: ''ارے جلد پانی لاؤ زخم دھوؤں'' پھر خیال آیا تو کہا ارے بھول گئی۔ پانی کہاں۔ پانی تو آل رسولؐ پر یزید کے حکم سے بند ہوئے تین روز گذر گئے'' سر سے ردا اتاری اور بھائی کا بازو کھول کر کہا۔ ''قیامت کے روز اسی طرح نانا جان کے حضور میں عرض کروں گی، آپ کی امّت نے میرا سر ننگا کیا۔''

معنی واشارے:

لختِ جگر	جگر کا ٹکڑا (بیٹا)
شیر خوار فرزند	دودھ پیتا ہوا بیٹا
عداوت	دشمنی
سرخ رو ہونا	کامیاب ہونا
سنگ دِل	پتھر دِل، سخت دِل
قیامت خیز	قیامت برپا کرنے والے/ والا
خاتم النبیین	جس نبی پر نبوت کا خاتمہ ہوا مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
عبا	ایک ڈھیلا ڈھالا لباس (عربی لباس)
کفش بردار	ادنیٰ مرتبہ، غلام بے دام
بشریت	آدمیت، انسانیت
فعل	کام
التجا	التماس
آفتاب آتش بار	آگ اگلتا ہوا سورج
قصد	ارادہ
حشر	قیامت

معروضی سوالات:

1۔ حضرت علی اصغرؑ حضرت امام حسینؑ کے کون تھے؟

(i) بڑے فرزند (ii) منجھلے فرزند

(iii) سب سے چھوٹے شیر خوار فرزند (iv) بھائی

2۔ سبق ''کربلا کا ننھا شہید'' کس کی تصنیف ہے؟

(i) علاّمہ راشد الخیری (ii) علامہ اقبال

(iii) پریم چند (iv) مولوی نذیر احمد

3۔ علامہ راشد الخیری کا اصل نام کیا ہے؟

(i) محمد عبدالرشید (ii) عبدالحکیم

(iii) عبدالغفار (iv) عزیز احمد

4۔ حضرت زین العابدینؓ کون تھے؟

(i) بی بی زینبؓ کے فرزند (ii) حضرت علیؓ کے فرزند

(iii) حضرت فاطمہؓ کے فرزند (iv) حضرت امام حسینؓ کے فرزند

5۔ ''کربلا کا ننھا شہید'' سبق میں کس کی شہادت کا تذکرہ ہے؟

(i) حضرت عباسؓ کی (ii) حضرت علی اصغرؓ کی

(iii) حضرت امام حسینؓ کی (iv) حضرت زین العابدینؓ کی

مختصر ترین سوالات:

1۔ بی بی فاطمہؓ کون تھیں؟

2۔ بی بی زینبؓ کا جناب علی اصغرؓ سے کیا رشتہ تھا؟

مختصر سوالات:

1۔ واقعہ کربلا کس جگہ پر واقع ہوا تھا؟

2۔ حضرت علی اصغرؑ کو کس نے تیر مارا تھا؟

3۔ سبق ''کربلا کا ننھا شہید'' کس کی تصنیف ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ علامہ راشد الخیری کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

2۔ کربلا کی جنگ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھئے۔

3۔ حضرت امام حسینؓ کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

(6)

مولانا ابوالکلام آزاد

[پیدائش 1888ء، وفات 1958ء]

ابوالکلام آزاد 1888ء میں مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ آزاد تخلّص کرتے تھے اور ابوالکلام ان کا لقب تھا۔ ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ مگر 1897ء میں ان کے والد مولانا خیر الدین نے مستقل طور پر کلکتّہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی تعلیم گھر میں ہوئی۔ وہ نہایت ہی ذہین تھے۔ چنانچہ بارہ برس کی عمر میں ہی عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مکمّل کر لی۔ اور پندرہ برس کی عمر میں طلبا کے ایک حلقے کو درس دینے لگے۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اس لیے انھوں نے امیؔر مینائی اور داغؔ دہلوی سے اصلاح لی۔ لیکن جلد ہی سیاست اور صحافت کی طرف مائل ہو گئے۔

ابوالکلام آزاد ایک عالم دین بھی تھے اور مفسر قرآن بھی، وہ ایک بے باک صحافی بھی تھے اور بہترین مدبر بھی، وہ دانشور بھی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار بھی۔ گویا وہ کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت کا باضابطہ آغاز کلکتہ سے جولائی 1912ء میں ہفتہ وار رسالہ ''الہلال'' نکال کر کیا۔

1915ء میں ''البلاغ'' نکالا جو پانچ ماہ بعد مارچ 1916 میں بند ہو گیا۔ مولانا آزاد ایک طویل مدّت تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے۔ جدید تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ ملک کی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے انھوں نے بہت کام کیے۔ 1958ء میں دہلی میں وفات پائی۔ ان کی قبر جامع مسجد کے نزدیک واقع ہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کا بیشتر حصّہ جیل میں گزرا۔ احمد نگر جیل میں ہی تھے کہ ان کی شریک حیات زلیخا بیگم کا انتقال ہو گیا۔ حکومت پیرول پر رہا کرنے کو آمادہ تھی مگر انھوں نے انگریزی حکومت سے کوئی رعایت حاصل کرنا گوارا نہیں کیا۔

'غبار خاطر' آزاد کے 24 خطوط کا وہ مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی اسیری میں 19/اگست 1942ء سے 15/جون 1945 کے درمیان اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے تھے۔ 'غبار خاطر' کے خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہنچے تھے۔ بعد میں اپنے دوست اجمل خاں کے اصرار پر انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان خطوط میں آزاد نے حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو صدیق مکرم سے مخاطب کیا ہے۔ آزاد نے 'غبار خاطر' کے علاوہ، 'الہلال'، 'البلاغ'، 'ترجمان القرآن'، 'تذکرہ'، 'کاروان خیال'، 'قولِ فیصل'، 'اعلان الحق' وغیرہ جیسی شاہکار کتابیں بھی تصنیف کیں۔

نصاب میں شامل سبق ''حکایت بادہ و تریاک'' مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ''غبار خاطر'' سے ماخوذ ہے۔ یہ آزاد کا ایک بہترین نثری نمونہ ہے۔

حکایت بادہ وتریاک

(مولانا ابوالکلام آزادؔ نے قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے دوران اپنے دل کا غبار دور کرنے کے لیے اپنے ایک عزیز دوست حبیب الرحمٰن خان شروانی کو کچھ خطوط لکھے تھے جو بعد میں ''غبارِ خاطر'' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ اقتباس ان کے ایک خط سے لیا گیا ہے۔ طلبہ کے معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے مشکل حصّے حذف کر دئے گئے ہیں۔)

قلعہ احمد نگر

۲۷/اگست ۱۹۴۲ء (1942)

صدیق مکرم

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، ایک اندر کی۔ دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں۔ قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔

لیکن جوں ہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریم دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کر دوں۔

''وقتست دگر بت کدہ سازند حرم را''

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں۔ میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے، جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ ''ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوش گوار بناؤ'' جس کا دستور العمل ہے۔

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے اس میں ایک جز رواقیہ (Stoics) [یونانی فلسفی زینو کے متبعین جو اپنے کو رنج و مسرت دونوں سے بے نیاز کہتے ہیں] کا ہے، ایک لذّتیہ کا (Epicureans) [فلسفی اپیکورس کے متبعین جن کا مشرب تھا کھاؤ، پیو، خوش رہو۔] جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ میں نے اپنے کاک ٹیل (Cocktail) [جب کئی قسم کی شرابیں ملا دی جاتی ہیں تو اس آمیزش کو کاک ٹیل کہتے ہیں۔] کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھئے کہ گویا حکایتِ بادہ وتریاک میں نے تازہ کر دی ہے۔ البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گساران کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermuth) اور جن (Gin) [شراب کی قسمیں] کا مرکب پینے والے اس رطل گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے، لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سروسامان کہاں میسر آ سکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی۔

ملے جو حسرتیں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم وخیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے عیش ومسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں:

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ، ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ وچمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کو کھول دے گا، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیران قید ومحن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گل گوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد وپیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا
یاں ، ورنہ جو حجاب ہے ، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے! یہاں سروسامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشے میں بھی گم نہیں ہوسکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالانکہ اگر اسے ڈھونڈ نکالیں تو عشرت و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔

ایوان و محل نہ ہوں، تو کسی درخت کے سایے سے کام لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے! اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوش نمائیاں اوجھل ہوگئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں! اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ! تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے! میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں زندگی کی ساری رونقیں اسی مے کدۂ خلوت کے دم سے ہیں، یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔

باہر کے ساز و سامان عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی

سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پر کیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈِبّا کھولتا ہوں، اور ایک ماہرفن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام وصراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سر و سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھئے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدا نا خواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا! میں جرعہ کشان کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا، اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں، طول دوں گا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا، اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔ اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوک قلم سے نکل رہی ہیں، اسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ 9/اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحت تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور

تازہ دم ہوکر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہوجاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیل گونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہوجائیں۔

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے ''سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے؟ پھر جواب دیا ہے ''جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے۔'' اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد، اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیئے کہ اپنے چہرے کو غم گین نہ بنائیں۔

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندرے ژیدا (Andre Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے۔ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا۔ وہ دوسروں تک بھی متعدّی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھُوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہوکر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔

''افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!''

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت متعدد آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں۔ اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غم ناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ اور اخلاق تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔

آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلس طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ راہدان خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بعض یاران بے تکلف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلس ما زاہد! زنہار تکلف نیست

البتہ تو می گنجی ، عمامہ نمی گنجد!

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی۔ آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ،

آب رواں کا ترنم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔

معنی اور اشارے:

حکایت	قصّہ، داستان
تریاک	افیون، افیم، اکسیر، زہر کا اثر دور کرنے والی دوا
خودرفتگی	عالم بے خبری، مستی، دیوانگی
سابقہ	نام سے پہلے اضافہ کیا جانے والا کلمہ
لاحقہ	کسی کلمے یا جزوِکلمہ کے بعد آنے والا حرف
دستورالعمل	تدبیر، طریقہ کار، قاعدہ، آئین، طور، اصول کار
کہنہ مشق	ماہر، تجربہ کار، پرانے
رطل	پیمانہ یا پیالہ (شراب کا)
دیبا	رنگین اور دبیز قسم کا قیمتی ریشمی کپڑا جس پر سنہرا یا پیلا ابھرا ہوا کام بنا ہوتا ہے۔
سبزہ خودرو	آپ سے آپ اگنے والا پودا
مصنوعی	بنایا ہوا، تیار کیا ہوا، بناوٹی، دکھاوے کا، ہاتھ یا مشین کا تیار کردہ
کامران	کامیاب
خلوت	تنہائی، علاحدگی
جام صبوحی	شراب کا پیالہ جو صبح کو پیا جائے
پیہم	پے در پے، متواتر، لگاتار، مسلسل
خواب آلود	نیند کے خمار میں بھرا ہوا
بادۂ کہن	پرانی شراب

دقیقہ سنج	باریک بین، تیز طبع، زود فہم، بہت جلد بات کی تہہ کو پہنچ جانے والا
جُرعہ	گھونٹ
امتدادِ کیف	ایک مدت تک سرور کی کیفیت، دیر تک مستی حاصل کرنا
سود وزیاں	نفع اور نقصان، برا بھلا
رواقِ دل	دل کا محل، بغیر ستون کا محل
افسردگی	اداسی
احتیاج	حاجت، ضرورت
متعدی	حد سے تجاوز کرنے والا، ظلم کرنے والا، پھیل جانے والا مرض
تقدس	پاکیزگی
طرب	خوشی، نشاط، (موسیقی) ستار یا سارنگی کے گونج کا تار جو اس کی ڈنڈی کی سطح سے ملے ہوئے تنے رہتے ہیں
زاہدانِ خشک	وہ زاہد جو ظاہری باتوں کا سختی سے پابند ہو مگر اس کا دل عشق الٰہی سے بے بہرہ اور روحانی لذت سے محروم ہو
موقلم	قلم کی نوک، کا برش مصوروں کا، نرم، بالوں سے تیار کردہ برش
آب رواں	بہتا ہوا پانی، آب جاری، عمدہ قسم کی باریک ململ

معروضی سوالات:

1۔ ''غبار خاطر'' کس کے خطوط کا مجموعہ ہے؟

(i) ابوالکلام آزاد (ii) غالبؔ

(iii) سرسید احمد (iv) شبلی نعمانی

2۔ آزاد کی سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1850 (ii) 1857

(iii) 1888 (iv) 1958

3۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کا نام کیا ہے؟

(i) ابوالکلام آزاد (ii) مہاتما گاندھی

(iii) جواہر لال نہرو (iv) سردار پٹیل

4۔ الہلال اور البلاغ کے مدیر کا نام کیا ہے؟

(i) محمد علی جوہر (ii) حسرتؔ موہانی

(iii) مولانا ابوالکلام آزاد (iv) پریم چند

5۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

(i) مکہ معظّمہ (ii) ایران

(iii) ہندوستان (iv) مدینہ منورہ

مختصر ترین سوالات:

1۔ تذکرہ ' کاروان خیال' کس کی کتاب ہے؟

2۔ ''حکایت بادہ وتریاک'' کا تعلق کس صنف سے ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے دوران مولانا آزاد نے اپنے کس دوست کے نام خط لکھے؟

2۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبار خاطر'' کی روشنی میں ان کے زبان و بیان پر اظہار خیال کیجئے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی حالات زندگی اوران کے ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے

2۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالئے؟

3۔ ابوالکلام آزاد کی مکتوب نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھئے؟

(7)

مولوی عبدالحق

[پیدائش 1870ء، وفات 1961ء]

بابائے اردو مولوی عبدالحق 20/ اگست 1870ء کو ضلع میرٹھ کے ہاپوڑ کے قریب قصبہ سراوہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہاپوڑ اور سراوہ میں حاصل کی۔ ان کے والد فیروز پنجاب میں ملازم تھے اس لیے ان کی آگے کی تعلیم پنجاب میں ہی ہوئی۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج آئے اور 1895ء میں بی۔ اے۔ کیا۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر تلاش معاش میں حیدرآباد چلے گئے اور ایک اسکول میں مدرس کی ملازمت قبول کر لی۔ پھر وہاں سے ترقی پا کر مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے اور 1916ء میں ''دارالترجمہ'' کی نظامت بھی انھیں کے سپرد ہوئی۔ اس ادارہ کا کام یہ بھی

تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے منتخب مضامین کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جائیں۔ مولوی عبدالحق نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اب انھیں انجمن ترقی اردو کو مستحکم کرنے کا موقع ملا۔ اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آخر میں عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہو گئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد 1937ء میں انھوں نے انجمن کے دفتر کو دہلی میں منتقل کیا اور خود بھی دہلی آ گئے اور اردو ادب نیز انجمن ترقی اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے 1937ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ملک تقسیم ہو گیا تو کراچی چلے گئے اور وہاں بھی اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ 11/ اگست 1961 کو کراچی میں ہی وفات پائی۔

مولوی عبدالحق کا یہ کارنامہ نہایت قابل قدر ہے کہ قدیم اردو ادب کا وہ سرمایہ جو مخطوطات کی شکل میں تھا، اور ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا مولوی صاحب نے انھیں ترتیب دے کر شائع کیا اور برباد ہونے سے بچا لیا۔ ان کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے، ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مصنّفین کے حالات زندگی دریافت کر کے ہم تک پہنچائے، ان تصانیف کے عہد کی خصوصیات واضح کر کے اردو تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔

مولوی عبدالحق ایک مشّاق اور پختہ کار ادیب تھے۔ تحقیقی کارناموں میں ''چند ہمعصر'' نہایت مشہور اور کامیاب کتاب ہے۔ تحریر میں لطفِ مزاح ہے مگر طنز نہیں۔ وہ بہت سادہ، بے تکلف اور سلیس زبان میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ ''مقدمات عبدالحق''، ''خطبات عبدالحق''، ''تنقیدات عبدالحق'' ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ فرہنگ لغت اور اصطلاحات پر بھی انھوں نے کام کیا۔

نصاب میں شامل مضمون مولوی عبدالحق نے یومِ چکبست کے موقع پر لکھا تھا جو 12/ فروری 1939ء کو ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں لکھنو میں منایا گیا تھا۔ اس موقع پر جو نظمیں اور مضامین حاصل ہوئے تھے وہ ایک مجموعے کی شکل میں یادِ چکبست کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہو چکے ہیں جس کے مرتب پنڈت آنند نرائن ملا ہیں۔ یہ مضمون اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

اس مضمون میں مولوی عبدالحق نے شاعری کی غرض وغایت کے ساتھ ساتھ چکبست کی شاعرانہ خصوصیات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ چکبست ''ایک قادرالکلام شاعر ہے۔ زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے۔ وہ ملک کی بےبسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بےچین ہو جاتا ہے اور اس حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ادب اُردو اور چکبست

ایک زمانہ تھا کہ ہماری شاعری لطف صحبت اور تفنن کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا۔ دولت تھی، ثروت تھی، حکومت تھی، فارغ البالی تھی، دوسرے دنیاوی کاروبار کے ساتھ سامان عیش بھی تھا اور اسی سامان عیش کا ایک جز شاعری بھی تھی۔ لیکن وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ زمانہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہمارے شاعر زمانے کی اس نیرنگی کو معشوقوں کے تلوّن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن بیچارے معشوق خود اِس زمانے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ البتہ ہمارے شاعر اب تک اس عیب سے بری رہے۔

دوستو! اب زمانہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ اب نئے دَور نے جنم لیا ہے۔ نئے حالات کے ساتھ نئے خیالات اُمڈے چلے آرہے ہیں اور اس کے ساتھ نئی نئی مصیبتیں اور آفتیں بھی ہمارے سر پر تُلی کھڑی ہیں۔ ان مصیبتوں کے ٹالنے اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں طرح طرح کی قربانیاں اور طرح طرح کی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اور اس جدوجہد کے لیے نئے آلات اور نئی حکمتوں کی ضرورت ہے کیا اس جدوجہد میں شاعر کا کوئی حصہ نہیں؟ کیا شاعر ہماری سوسائٹی اور ہماری قوم کا جزو نہیں؟ کیا وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہے؟ کیا وہ ہمارے آرام وآسائش اور ہمارے دکھ درد اور ہماری مسرّتوں اور آلام میں شریک نہیں؟ کیا اس کا کام صرف مسخرگی اور دل لگی ہے؟ کیا اس کا دل ایسا پتھر اور اس کی جلد ایسی موٹی ہے کہ اس پر کسی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا؟ اگر یہ ہے تو وہ شاعر نہیں مسخرہ ہے۔

فن شعر کے لحاظ سے شاعر کی دو حیثیتیں ہیں ایک نجی حیثیت ہے یعنی یہ کہ وہ شعر کس طرح کہتا ہے۔ مثلاً چت لیٹ کے یا پٹ لیٹ کے کھڑے کھڑے یا لیٹے لیٹے، ٹہل ٹہل کر یا باقاعدہ میز کرسی پر بیٹھ کر اس سے ہمیں کچھ بحث نہیں۔ دوسری حیثیت اس کی وہ تعلق ہے جو اسے جمہور سے ہے اور یہی اس کی شاعری کی کسوٹی ہے۔ یہ تعلق کیا ہے؟ اسے میں

ایک جملے میں عرض کیے دیتا ہوں۔ شاعر خلق اللہ کے لیے وہ کچھ کرسکتا ہے جو وہ خود اپنے لیے نہیں کرسکتا۔ شاعری میں ایک عنصر ایسا بھی ہوتا ہے جو اُسے ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے اور اُسے اصلی اور حقیقی دنیا سے کچھ واسطہ نہیں رہتا اور اُس عالمِ خیال میں اُسے خاص لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ اکثر نقّاد شاعری کا مقصد صرف یہی سمجھتے ہیں۔ اگر شاعر اُس عالمِ خیال میں پہنچ کر وہیں کا ہو جائے تو بہک جاتا ہے۔ لیکن اصلی شاعر اس عالم میں پہنچ کر اپنے اصلی اندیشوں، اصلی خواہشوں، اور اصلی امیدوں اور دل کی تہہ میں چھپے ہوئے رازوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ تڑپ اٹھتا ہے اور یہ تڑپ اُسے حقیقی اور زندہ دنیا کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اُسے اِس بدلتی ہوئی دنیا کے مقابلے کے لیے زیادہ اہل بنا دیتی ہے۔

ہم ایک دوسرے کے معاملے میں ضرور دلچسپی لیتے ہیں لیکن یہ دلچسپی ایک قسم کا تفنّن ہوتا ہے جیسے اخباروں میں کرکٹ اور فٹ بال کے میچوں کے ذکر یا آپس کے تنازع اور جھگڑے سے۔ یہ دلچسپیاں عارضی ہیں۔ ان سے ہم دردی نہیں ہوتی جب تک کوئی ایسی قوت نہ ہو جو لوگوں کو ناانصافی، رسم و رواج کے تشدد اور گمراہیوں کے خلاف آمادہ کردے۔ کبھی کوئی سچی ہمدردی اور حقیقی اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا۔ سیاسی لیڈر یہ بات پوری طرح پیدا نہیں کرسکتے، اس لیے کہ وہ لوگوں کے تخیل کو نہیں ابھار سکتے۔ یہ شاعر ہی ہے جو اُن کے تخیل کو گُدگُداتا اور دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتا ہے اور انھیں ایک رشتہ میں منسلک کردیتا ہے۔ وہ اپنے زورِ بیان، تشبیہوں اور استعاروں، مبالغے اور تخیل کے زور سے منتشر قوتوں کو ایک جا جمع کردیتا ہے۔ افراد کو جماعت میں منتقل کردیتا اور کثرت کو وحدت میں بدل دیتا ہے۔ ساری قوم ایک فردِ واحد ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اُن میں جذبہ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کے اُس مقصد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جس کی رہ نمائی ایک سچا شاعر ہی کرسکتا ہے۔

ملک میں افلاس ہے، جہالت ہے، غلاظت ہے، گم راہی ہے اور نہ معلوم کیا کیا خرابیاں ہیں کیا یہ اس لیے ہیں کہ لوگ جہالت، افلاس کو اچھا سمجھتے ہیں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اِن لعنتوں کو اچھا سمجھتا ہو۔ جب سب برا سمجھتے ہیں تو پھر ان کا وجود کیوں ہے؟ یہ ہیں اور رہیں گی۔ اس لیے کہ جو لوگ اِن لعنتوں میں مبتلا نہیں وہ اُن سے کامل ہم دردی نہیں رکھتے جو ان میں مبتلا ہیں کامل ہمدردی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ مصیبت زدہ کے رنج و تکلیف کا حقیقی احساس ہو، یعنی وہ شخص

اپنے اوپر وہی حالت طاری کرے جو مصیبت زدہ پر ہے، اور یہ کیفیت صرف تخیل کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی لیڈر کامیاب نہیں ہوتا اور سچا شاعر کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس قدر جس کا تخیل قوی اور تیز ہوگا اسی قدر وہ اپنے اوپر دوسروں کی حالت طاری کرے گا اور اُسی قدر اس کی ہمدردی زیادہ قوی اور کامل ہوگی۔ شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ تخیل کو گُد گُداتا اور اُبھارتا ہے اور اس میں خیال، جذبہ، عمل سب کچھ آ جاتا ہے۔

حضرات! یہ کام ہماری اردو کے تین (3) شاعروں نے انجام دیا۔ حاؔلی، چکبستؔ اور اقباؔل۔ ان کے کلام میں خلوص، درد اور جوش پایا جاتا ہے اور ان تینوں نے ملک اور قوم کی وہ ضروری اور اعلیٰ خدمت انجام دی ہے جو کسی دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ یورپی نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا ماحصل لطف وحظ ہے۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ انھیں فارغ البالی حاصل ہے، سامان عیش و آرام مہیّا ہے، تمدن کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں ہمیں صرف لطف حاصل کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ہمیں سکون و جمود کو بھی توڑنا ہے، غفلت و کاہلی کو مٹانا ہے، دلوں میں احساس اور حرکت پیدا کرنی ہے اور سچ پوچھیے تو مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ ہمیں ایسے ہی شاعروں کی ضرورت تھی جیسے حاؔلی، چکبستؔ اور اقباؔل ہیں اور ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے نغموں اور نالوں سے قوم کو جگانے کا کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم دل سے ان کا احترام اور عزّت کرتے ہیں۔

یوں تو میں نے چکبستؔ کا کلام پڑھا تھا، لیکن تین سال کا عرصہ ہوتا ہے میرے ایک طالب علم نے جس کا مضمون اردو تھا اپنے مقالے (تھیسس) کے لیے چکبست کو انتخاب کیا اسے یہ کام میری نگرانی اور ہدایت میں کرنا تھا۔ طالب علم محنتی اور شوقین تھا۔ محنتی اور شوقین طالب علم استاد کے لیے وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ مجھے بھی چکبست کا کلام غور سے پڑھنا پڑا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسا قادرالکلام شاعر ہے۔ زورِ بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے۔ وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بیچین ہو جاتا ہے اور اُس حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچّا لبرل ہے اور اس رستے پر چلنے والا ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے۔ لوگ اعتدال پر ہنستے ہیں اس لیے کہ وہ اس پر چل نہیں

سکتے۔ وہ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے مگر یورپ کا اندھا مقلد نہیں وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم ورواج سے خوب واقف ہے اوران کے عیب چن چن کر دکھاتا ہے لیکن وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ نئے خیالات کی رو میں ہماری خوبیاں بھی بہہ جائیں۔ وہ جذبات انسانی سے گہری واقفیت رکھتا تھا اور بعض اوقات نازک جذبات کو موقع پر بڑی خوبی اور حُسن سے ادا کر جاتا ہے۔

اس کا مشاہدہ بھی معمولی نہیں وہ حقیقت اور واقعیت کو خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھینچ جاتی ہے اور یہ سب باتیں اُس زبان میں فصاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو ہماری تہذیب اور یک جہتی کی سب سے بڑی اور قابل قدر یادگار رہے اور آئندہ بھی آپس کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس نے اپنے کلام سے اُردو زبان کا رتبہ بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اُردو ادب میں اپنی جگہ قائم کر دی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں ہے۔

معنی اور اشارے:

تفنّن	خوش طبعی، دل لگی
فارغ البالی	خوش حالی، بے فکری
نیرنگی	جادوگری، فریب، شعبدہ بازی
عجیب الخلقت	تمام مخلوقات میں منفرد
افلاس	غربت، مفلسی
غلاظت	گندگی، نجاست
ماحصل	حاصل ہونے والا، نچوڑ
جمود	جم جانا، ٹھہر جانا
دلدادہ	عاشق، فریفتہ
اعتدال	میانہ روی
فصاحت	خوش کلامی، خوش بیانی

معروضی سوالات:

1۔ مولوی عبدالحق کی سنۂ پیدائش کیا ہے؟

(i) 1870 (ii) 1875

(iii) 1912 (iv) 1926

2۔ ''یادچکبست'' کس کے مضامین کا مجموعہ ہے؟

(i) اسداللہ خاں غالبؔ (ii) سرسیداحمد

(iii) مولوی عبدالحق (iv) ابوالکلام آزادؔ

3۔ عبدالحق کوڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری کب حاصل ہوئی؟

(i) 1936 (ii) 1937

(iii) 1940 (iv) 1942

4۔ ''چندہمعصر'' کس کی کتاب ہے؟

(i) نذیراحمد (ii) محمد حسین آزاد

(iii) رشیداحمدصدیقی (iv) مولوی عبدالحق

5۔ مولوی عبدالحق کی وفات کہاں ہوئی؟

(i) دہلی (ii) کراچی

(iii) لکھنؤ (iv) علی گڑھ

مختصرترین سوالات:

1۔ بابائے اردو کسے کہا جاتا ہے۔

2۔ اکثر نقادشاعری کا مقصد کیا سمجھتے ہیں؟

3۔ مولوی عبدالحق کی تصنیف کا نام لکھئے۔

مختصرسوالات:

1۔ اس سبق میں مولوی عبدالحق نے اردو کے کون سے تین شاعروں کا ذکر کیا ہے؟

2۔ ہماری تہذیب اور یکجہتی کی سب سے قابل قدر چیزیں کیا ہیں؟

تفصیلی سوالات:

۱۔ چکبست کی شاعری کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟

۲۔ مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ نصاب میں شامل مضمون ''ادب اردو اور چکبست'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

(8)

آل احمد سرور

[پیدائش 1911ء، وفات 2002ء]

پروفیسر آل احمد سرور کی پیدائش 9رستمبر 1911ء کو اتر پردیش کے بدایوں میں ہوئی۔ ان کے والد کرم احمد پوسٹ آفس میں ملازم تھے اور ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے سرور صاحب کا بچپن بدایوں، میرٹھ، پیلی بھیت گونڈہ، سیتاپور، غازی پور وغیرہ مقامات پر گزرا، اس لیے تعلیم بھی مختلف جگہوں پر ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کر کے شعبہ انگریزی سے وابستہ ہو گئے پھر اردو میں ایم اے کر کے شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ رضا انٹر کالج رام پور میں پرنسپل اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں ریڈر بھی رہے۔ 1955 میں اردو کے پروفیسر ہو کر علی گڑھ آئے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اقبال

انسٹی ٹیوٹ سری نگر کے ڈائرکٹر ہو کر کشمیر چلے گئے، وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ واپس ہوئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی اور شعبۂ اردو کے پروفیسر ایمریٹس کا اعزازی منصب قبول کر لیا۔

اُن کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ ہند اور مختلف اکیڈمیوں نے انھیں اعزازات وانعامات سے بھی نوازا جن میں اتر پردیش اردو اکیڈمی انعام، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، پدم بھوشن انعام اور اقبال سمّان جیسے بڑے انعامات شامل ہیں۔ 9رفروری 2002 کو دہلی میں انتقال کیا۔

آل احمد سرور ایک ممتاز نقاد تھے۔ غیر جانبداری، انصاف پسندی اور وسعت خیالی ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں جو ان کی تنقیدی نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کی تنقید کا ایک خاص وصف ان کا دل نشیں اسلوب بھی ہے جس میں سادگی بھی ہے اور رعنائی بھی۔ ان کے لہجے میں نرمی، متانت اور سنجیدگی ہے۔ آل احمد سرور کی تحریر میں تقریر کی خوبیاں موجود ہیں۔ آپ کے اکثر مضامین ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوتے رہتے تھے۔ ایسے مضامین کا مجموعہ ''تنقیدے اشارے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

سرؔور کی نثر، تنقید کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ یہ نثر حالؔی، شبلؔی، اور آزاؔد کے بعد ایک متوازن تنقیدی شعور کا پتہ ہی نہیں دیتی بلکہ ایک ایسی تنقید کا آغاز کرتی ہے جس میں غزل کی سرمستی، نظم کا زورِ بیان، قصیدے کا شکوہ، مرثیہ کی جذبات نگاری اور مثنوی کی واقعات پسندی سب ہی کچھ یکجا ہو گئی ہے۔

'تنقید کیا ہے'، 'ادب اور نظریہ'، 'نئے اور پرانے چراغ'، 'تنقیدی اشارے'، 'نظر اور نظریے'، 'مسرت سے بصیرت تک' اور 'دانشور اقبال' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

داخل نصاب سبق سرور صاحب کے ایک طویل مضمون سے ماخوذ ہے جو ان کے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ''نئے اور پرانے چراغ'' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں اردو کے نئے ادبی شعور سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے سرور صاحب کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

نیا ادبی شعور

آزادؔ نے جدید شاعری کی تحریک شروع کرتے وقت کہا تھا کہ ''زبان اردو کا جو سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے'' خدا کا شکر ہے کہ آج یہ جملہ صحیح نہیں۔ گذشتہ ستر (۷۰) اسّی (۸۰) سال میں اُردو نثر کا ایک ایسا سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ یہ کل کی چھوکری، بقول مہدی کے ''دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھ ملا سکتی ہے'' اس کے باوجود اپنے سارے ادب کا جائزہ لیتے وقت ہمیں زیادہ تر شاعری ہی کا سرمایہ نظر آتا ہے۔ میرؔ کے زمانے کو لیجئے ادب زیادہ تر شاعری سے عبارت تھا۔ نثر میں کچھ مذہبی رسالے کچھ نیم متصوّفانہ قصّے، کچھ شاعرانہ تقریظیں ملتی تھیں۔ فورٹ ولیم کی تحریک شروع ہونے والی تھی، مغرب کا عمل دخل شروع ہو گیا تھا۔ مگر سیاسی طور پر مغربی خیالات کی ابھی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی شاعری باوجود انحطاط، سیاسی پستی اور زوال آمادہ تمدن کے خاصی تندرست اور جان دار تھی، ایک فن شریف سمجھی جاتی تھی۔ یہ بیش تر حسن کے ترانے گاتی تھی مگر ماحول سے بیگانہ نہ تھی۔ سوداؔ کی ہجویات ہوں یا میرؔ کے نشتر اُن میں جو چبھن ہے وہ صرف آپ بیتی کی نہیں بلکہ جگ بیتی کی بھی ہے یہ جذبات سے مملو، سادہ کار و سادہ خیال ماحول کی تلخیوں، شخصی ناکامیوں کے احساس کو یا تو عشقیہ قصّوں کے ذریعے سے بھلاتی تھی یا قصائد کی ذہنی پرواز کے ذریعہ سے یہ دربار کی دست نگر تھی اور خانقاہ سے عقیدت رکھتی تھی۔ نتیجے کے طور پر اس میں خمریات و معاملات بھی تھے اور متصوفانہ خیالات بھی۔ اس میں فن کا ایک اچھا تصوّر تھا جو بہت سخت گیر نہ تھا مگر جو کھرے کھوٹے کو پہچانتا تھا۔ اُس میں زبان کی فطری صلاحیتوں سے آگاہی تھی اور اس کے ہندوستانی عنصر کا اعتراف۔ اس میں سب کچھ اس کا اپنا نہ تھا۔ بہت کچھ فارسی کے خیالات اور علامات کا بھی تھا۔ مگر اس میں اپنے عنصر پر فخر و مباہات اور اپنی انفرادیت کا احساس بھی نمایاں تھا۔ گویا یہ شعور محدود تو تھا کیونکہ انفعالی طور پر ماحول کے اثرات کو جذب کر کے شعر میں بیان کرنے پر قانع تھا اور پھر نثر کی عظمت سے قطعی بے بہرہ تھا اور فارسی کے پُرتکلف

اسلوب میں دادِ سخن دے کر تسکین دے لیتا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے چونکہ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، قائمؔ، مصحفیؔ و جرأتؔ کو جنم دیا تھا اور اس میں ولیؔ، سراج، شاہ حاتمؔ مظہر جان جاناں کی لے بھی شامل تھی، اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب انیسویں صدی شروع نہیں ہوئی تھی غدر سے پہلے اردو ادب کا جائزہ لیجیے تو جس طرح ہمیں پچھلے دَور میں میرؔ نظر آتے ہیں اسی طرح اس دور میں غالبؔ کی دیو پیکر شخصیت ملتی ہے۔ گو غالبؔ کا اثر اس دور کے بعد شروع ہوا۔ اس عرصے میں ادبی سرمایے میں فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک مذہبی اصلاح کا جوش، دہلی کالج، افسانوی اور داستانی لٹریچر، صحافت کے بعض ابتدائی نمونے اور غالبؔ کے شروع کے خطوط میں ملتے ہیں۔ اس کے اثر سے ادب محض شاعری تک محدود نہیں رہا۔ نثر میں بھی عام پُر تکلف اور مقفّیٰ اسلوب کے دوش بدوش ہمیں سادگی کی تحریک ملتی ہے، جو کبھی دب جاتی ہے اور کبھی اُبھر آتی ہے۔ مگر کبھی بھی بالکل ختم نہیں ہوتی۔ مگر نظم میں جس نے میرؔ کی دنیا سے قدم آگے تو کم بڑھایا ہے زیادہ تر اپنی حدود میں وسعت پیدا کی ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں ادبی شعور نثر کے حسن پر بھی دزدیدہ نظر ڈال لیتا ہے مگر اس کا قائل نہیں۔ وہ شعر کی دنیا میں جذبات کی مطلق العنانی کو کافی نہیں سمجھتا اور غالبؔ کے ہاتھوں اسے ایک ذہن دیتا ہے جو عام طور پر تو ناسخؔ و آتشؔ، ذوقؔ و ظفرؔ کا دل دادہ ہے۔ مگر جب بلند ہوتا ہے تو غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، انیسؔ کے ساتھ پرواز کر سکتا ہے جو اب بھی شیفتہؔ جیسے رئیس کے روپ میں نظیر کے تندرست، حقیقت نگار اور عام پسند نغمے کو بقائے دوام کے دربار کے قابل نہیں سمجھتا، جو دبیرؔ کو انیسؔ پر ترجیح دے سکتا ہے۔ جو مشکل قوافی، لمبی لمبی ردیفوں اور دور از کار تشبیہوں پر وجد بھی کر سکتا ہے جس میں فن کا احترام فن کی حیثیت سے ہے چاہے اس میں حسن ناپید ہو۔ جو تذکروں اور بیاضوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، جسے ہزاروں اشعار از بر ہیں، جو ہر صنفِ سخن کو جانتا ہے مگر صرف غزل کو مانتا ہے، جس کی آنکھیں یوں تو اِدھر اُدھر بھی دیکھتی ہیں مگر زیادہ تر اندر کی طرف۔ جو چاول پر قل ہو اللہ لکھنے، نقش نگینے بنانے اور مینا کاری کرنے کو بہت کچھ سمجھتا ہے، جو گہرائی، استعارہ، چستی بلاغت کا زیادہ قائل ہے۔ تفصیل، وضاحت، صحت، حقیقت سے زیادہ مانوس نہیں۔ جو شاعری سے بڑھ کر اُستادیِ فن سے بڑھ کر پینترے، روانی سے بڑھ کر صنعت گری کا ماننے والا ہے، جو زبان کو اور زیادہ شہری، پُر تکلّف، تند جبیں بنا دیتا ہے۔ جس میں ٹھہرے ہوئے پانی کا سکون ہے۔ پچھلے دور کی

جذباتی ہلچل اور معصوم سادگی نہیں ہے۔

ہم آج بھی اس دور کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اُس کی عظمتوں کے قائل ہیں۔ مگر اُس کی پستیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کرنا جذباتی نقطۂ نظر سے درست ہو تو ہو، ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ اس وقت سے آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اتنی ہیں کہ اُن کا گِنا نا بھی آسان نہیں۔ ہم چاہیں تو سہولت کے لیے دو عنوانوں کے تحت ہیں انھیں سمجھ سکتے ہیں۔ غدر کے بعد ایک اصلاحی دور ہے، جو بیسویں صدی کے آغاز تک بلکہ جنگِ عظیم کے شروع تک چلتا ہے۔ اس کے بعد ایک انقلابی دور آتا ہے۔ پہلے دور میں تبدیلیاں نسبتاً آہستہ آہستہ ہوتی ہیں۔ ادب اور زندگی کا ایک نیا تصوّر، ایک نیا اخلاقی اور اصلاحی جذبہ جو ''شخصی'' نہیں ''قومی'' ہے مقصدی ادب کا عروج اور پیامی شاعری کی گرم بازاری، نثر کا ایک بڑے اور نئے پیمانے پر رواج، ایک نئے اور کارآمد اسلوب کی دریافت، قصّے کہانیوں اور داستانوں کے بجائے ناول افسانے اور ڈرامے کا رواج، تنقید، مضمون نگاری، صحافت، طنز و ظرافت، سوانح نگاری کا آغاز، انگریزی کا روز افزوں اثر، حال سے بے اطمینانی، وطن پرستی، فطرت نگاری، سیاسی میلانات کی عکّاسی، یہ فہرست اتنی بڑی ہے کہ اس کا دُہرانا یہاں ناممکن ہے لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو، وہ ادبی شعور جو حالؔی، اسمعیلؔ، چکبستؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی نظم اور سرسیّد، حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد، شرؔر، سجّادؔ حیدر کی نثر سے متاثر ہوا ہو، اس کو اپنا چکا ہو اور اس میں ڈوب چکا ہو، اس شعور سے بہت مختلف اور علیحدہ ہے، جو صرف میرؔ و سوداؔ، آتشؔ و ناسخؔ، غالبؔ و مومنؔ کی غزلوں، انیسؔ کے مرثیوں اور سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدوں سے مانوس تھا۔ حالؔی نے جب کہا تھا۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دُکان سب سے الگ

تو ممکن ہے یہ اس وقت صحیح رہا ہو لیکن آج حالؔی کی دکان پر کتنی رونق اور حالؔی کی جنس پر مُہر ہو، اس مال کی بازار میں کتنی وقعت ہے؟ بات یہ نہ تھی کہ حالؔی اور ان کے ہم عمر پرُحسن کا احساس کم رکھتے تھے، یا وہ شیریں نغموں پر قادر نہ تھے یا وہ اُن جادو کے دریچوں (Magic Casements) کا حسن دیکھ نہ سکتے تھے۔ جن کی طرف (Keats) نے اشارہ کیا

ہے، بلکہ دراصل ان کا ادبی شعور زیادہ حاضر، زیادہ حقیقت پسند اور زیادہ صحت مند تھا۔ اُن کی اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن میں پرانے گرم مسالوں اور معاملات کے چٹخاروں سے زیادہ مزا نہ تھا۔ مگر اس میں یقیناً غذائیت زیادہ تھی۔ وہ ذہنی آسودگی جو اس سے پہلے کا ادب بخشتا تھا، اس نشے کی طرح تھی جو محض غم غلط نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ جسم کے عضلات کو مجروح بھی کرتا رہتا ہے۔ وہ مزاج کو بھی تن آسانی، کاہلی اور تعیّش کا عادی بناتا تھا۔ حالؔی کیوں ساری عمر روتے رہے؟ یہ انھیں کی زبان سے سنیئے :

سنتے ہیں حالؔی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کُھلی

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حُسن و عشق کی
اور تصوّف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جاکر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑ نے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

حالؔی نے محض شاعری ہی کو نہیں نثر کو بھی دلفریبی کے بجائے دل گدازی، صنعت گری کے بجائے سادگی، مبالغہ کے بجائے حقیقت پسندی سکھائی۔ انھوں نے ادب سے ایک کام لیا، لیکن چونکہ یہ کام ایک اہم، وقیع اور بلند پایہ کام تھا، اس لیے ادب بھی اس سے بلند ہوا۔ اسمٰعیل کی ''صبح'' کی طرح اس نے ''پکارے گلے'' اپنے آنے کا اور مقصد کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ اقبالؔ کے ہاتھوں ادب محض اپنے مقصد کے اعلان پر قانع نہیں رہا۔ بلکہ اس نے اِس مقصد کو سب کچھ قرار دیا۔ اسے نشانِ راہ ہی نہیں منزل بھی ٹھہرایا اور اس طرح اس کام کو مکمل کیا گیا۔ جو حالؔی کے ہاتھوں شروع ہوا تھا۔

اقبالؔ نے شعر و ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہیں۔ مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفۂ زندگی پر عصری رُجحانات کا بڑا اثر ہے۔ وہ اپنے دور کی ضروریات پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں جب وہ 'ضربِ کلیم' میں اپنے ناظرین کو زندگی کے حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں، تو ان کے ذہن میں وہ حقائق ہیں، جواب تک

ان کے حلقے کی نگاہ سے اُوجھل تھے۔ چنانچہ اُن کے یہ الفاظ:

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں ، نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

یا اُن کے اس قسم کے اشعار:

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سُبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اُس حلقے کو ایک نیا ولولۂ حیات دینے کے لیے کہے گئے ہیں، جواب تک ''کوکنار'' کا خوگر تھا۔ اس لیے شاعر جان بوجھ کر ادبی ذوق کو آتشیں نفس بنانا چاہتا ہے۔ تاکہ اس میں خودی، ذوقِ یقیں، طاقت، صحت اور زندگی پیدا ہو۔ اقبالؔ اور جوشؔ دراصل طاقت کے علمبردار ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں طاقت میں حسن ہے، اگر چہ یہ طاقت محض جسمانی اور فوق فطری نہیں، ذہنی بھی ہے۔ جوشؔ کے یہاں طاقت کا جسمانی پہلو زیادہ عزیز ہے۔ ''موت کی کلائی موڑنا'' ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان دونوں کے اثر سے ہماری قدرے مدقوق، جذباتی، افسردہ، بجھی ہوئی نسلوں کو امید کی ایک کرن اور امنگوں کا ایک طوفان ملا ہے۔ اُس کی رگوں میں خون زیادہ تیزی سے گردش کرنے لگا ہے۔ یہ زیادہ باغیانہ ہوگئی ہے اور کچھ کر گزرنے کے لیے بیتاب ہے۔ یہ ایک اچّھی علامت ہے مگر اقبالؔ یا جوشؔ کے پیغام سے یہ اخذ کرنا کہ ادب کا مقصد لہو ترنگ یا شکوہ خسروی یا خاراشگافی ہی ہے اِن شعرا کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اچھے ادبی تصوّر میں جنگ وصلح دونوں کی دعوت اور دونوں کا

سامان ہے۔ شیرانِ خاب اور غزالانِ تاتاری دونوں کا حصّہ ہے اور دریاؤں کے دل ہلا دینے والے طوفان کی گرج کے ساتھ جگر لالہ میں ٹھنڈک پہنچانے والی شبنم کی بھی سمائی ہے۔ اسے نظر انداز کرنا ادب کے نصب العین کو نظر انداز کرنا ہے۔

میری ان باتوں سے یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ جدید نسل کے ادبی شعور میں صرف انقلابی یا باغیانہ خیالات کی ہی کارفرمائی ہے۔ میں نے تو محض تبدیلی کی انتہا کو واضح کرنے کے لیے اس کی طرف پہلے اشارہ کیا ہے، ورنہ انصاف یہ ہے کہ اِس میں قوس وقزح کے رنگوں کی طرح کتنے ہی ہلکے اور گہرے، تلخ اور شیریں عناصر موجود ہیں۔

معنی اوراشارے:

تحریک	حرکت، جنبش
متصوّفانہ قصّے	صوفیا کے قصّے
شاعرانہ تقریظیں	کسی کے دیوان سے متعلق تاثراتی تحریریں جو دیوان کے اخیر میں شامل ہوتی تھیں
انحطاط	زوال
تمدّن	طرز معاشرت
ہجویات	ایسی نظمیں جن میں شخصیت کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے
اعتراف	تسلیم کرنا
صحافت	اخبار نویسی
تعیّش	عیش وعشرت
کوکنار	پوست، خشخاس کا ڈوڈہ
خوگر	خواہش رکھنے والا
مدقوق	تپ دق کا مریض
شکوہ خسروی	حکمرانی کا شکوہ
خاراشگافی	پتھر میں شگاف لگانے والا
شیران خاب	خاب کے شیر
غزالان تاتاری	تاتاری ہرن
نصب العین	اصل مقصد، اصل مدعا

قوس وقزح	دھنک، ست رنگی کمان
لہوترنگ	ایسا نغمہ جس میں خون دل شامل ہو

معروضی سوالات:

1۔ ''تنقیدی اشارے'' کس کی تصنیف ہے؟

(i) احتشام حسین (ii) مولوی عبدالحق

(iii) آل احمد سرور (iv) راشدالخیری

2۔ ''اچھے ادبی تصوریں جنگ اور صلح دونوں کی دعوت اور دونوں کا سامان ہے'' یہ قول کس کا ہے؟

(i) احتشام حسین (ii) آل احمد سرور

(iii) حسن عسکری (iv) وقار عظیم

3۔ آل احمد سرور کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

(i) دہلی (ii) لکھنؤ

(iii) بدایوں (iv) مرادآباد

4۔ آل احمد سرور کا انتقال کب ہوا؟

(i) 2001 (ii) 2002

(iii) 2004 (iv) 2006

مختصر ترین سوالات:

1۔ جدید شاعری کی تحریک کس نے شروع کی تھی؟

2۔ غدر کے بعد اصلاحی دور کب سے کب تک مانا جاتا ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ میر تقی میرؔ کے دور کے چند شعراء کے نام لکھئے؟

2۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ادب میں کیسی عبارتیں زیادہ ملتی تھیں؟

3۔ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفۂ زندگی پر کس کا زیادہ اثر ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالئے۔

2۔ آل احمد سرور کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

3۔ آل احمد سرور کے حالات زندگی پر ایک نوٹ لکھئے۔

حصه شعر و نظم

1- غزل

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کی بات کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شعر میں غزل سے مُراد وہ صنف ہے جس میں حسن وعشق کے حوالے سے اشعار کہے جاتے ہیں۔ ابتدا میں غزل کے خاص موضوع حُسن وعشق سے متعلق احساسات وخیالات ہی تھے لیکن وقت کے ساتھ اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی اور اس نے حیات وکائنات کے دیگر موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دینی شروع کردی جس سے غزل کے مضامین میں رنگارنگی اور تنوع پیدا ہوگیا۔ بقول آل احمد سرور:

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمھاری بات بھی ہے

غزل کا پہلا شعر، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں، مطلع کہلاتا ہے۔ بعض مطلعوں میں صرف قافیہ کا ہی اہتمام کیا جاتا ہے اور ایسی غزلوں کو 'غیر مردف' غزل کہا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سے زائد مطلع بھی ہوسکتے ہیں۔ مطلع کے بعد آنے والے پہلے شعر کو حسنِ مطلع کہا جاتا ہے اور اس کے آخری شعر کو، جس میں شاعر اپنا تخلص ظاہر کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ ایک غزل میں کم سے کم پانچ اشعار کا ہونا ضروری ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد متعین نہیں لیکن زیادہ لمبی غزل اچھی نہیں ہوتی، اس لئے اس معاملے میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ اکیس اشعار کی غزل کہنی چاہئے کیوں کہ ایجاز واختصار غزل کا حسن ہے۔

غزل کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور اپنے اندر معنی کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ زیادہ تر غزلوں میں ریزہ خیالی پائی جاتی ہے اور ان میں تسلسل کا فقدان ہوتا ہے اور یہی غزل کا فنی حسن بھی ہے،

لیکن ایسی غزلیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن کے اشعار میں معنوی اعتبار سے ربط و تسلسل موجود ہوتا ہے، ایسی غزلوں کو غزل مسلسل کہتے ہیں۔

اردو میں غزل کی روایت بہت پُرانی ہے۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے یہاں وافر تعداد میں غزل کے نمونے ملتے ہیں، لیکن اس کو مستحکم بنیاد فراہم کرنے میں ولی دکنی نے اہم کردار ادا کیا جس کے باعث ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا گیا۔ دکن میں ولی کے علاوہ سراج اورنگ آبادی نے تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی غزلیں کہیں۔ شمال کے شعرا میں آبرو، یک رنگ، سودا، درد، میر، سوز، قائم چاند پوری، آتش لکھنوی اور ناسخ نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ عہدِ غالب میں غالب کے علاوہ، مومن، ذوق، مجروح بھی غزل کے معتبر شاعر ہوئے۔ جہاں داغ دہلوی، امیر مینائی، اور شاد عظیم آبادی نے غزل کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا وہیں اُن کے شاگردوں نے بھی غزل کو مقبول بنایا۔ حالی نے جدید فکر سے غزل کو آشنا کیا اور جدید غزل کی داغ بیل ڈالی جس کو حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی جیسے شعرا نے پروان چڑھایا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی وغیرہ نے غزل کو نئے سیاسی سماجی تناظر سے آشنا کیا اور اس کا رشتہ سماجی سروکار سے جوڑا۔

آزادی کے بعد غزل کے مضامین اور طرز و اسلوب میں تبدیلی آئی۔ اس دور کی غزل کو نئی غزل یا جدید تر غزل سے تعبیر کیا گیا۔ نئی غزل کے ممتاز شعرا میں ناصر کاظمی، ابن انشا، ظفر اقبال، احمد مشتاق، سلطان اختر، صدیقی مجیبی، پرکاش فکری، شہریار، عرفان صدیقی، عادل منصوری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اُن کے بعد کی نسلوں میں شہپر رسول، خورشید اکبر، عالم خورشید، مہتاب حیدر نقوی، جمال اویسی، کوثر مظہری، ظہر رحمتی، راشد انور راشد وغیرہ آتے ہیں جو غزل کے کارواں کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

(1)

خواجہ میر درد

[پیدائش 1721ء، وفات 1785ء]

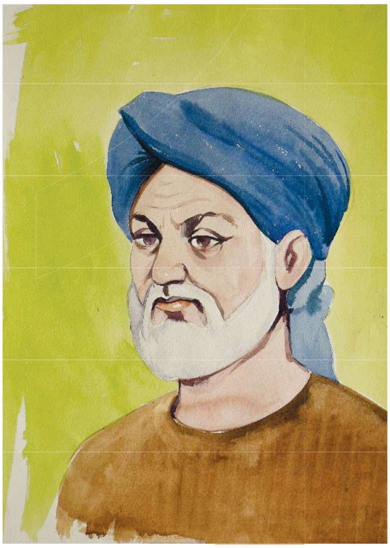

میر دردؔ کا اصل نام خواجہ میر تھا۔ جب شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے تو دردؔ تخلص اختیار کیا اور خواجہ میر درد کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ اُن کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب فارسی زبان کی جید عالم اور شاعر کے ساتھ ایک صوفی منش انسان تھے۔ دردؔ کی روحانی تربیت والد کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ 1785ء میں دہلی میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

دردؔ کا ایک مختصر دیوان اردو میں موجود ہے جس میں اُن کی غزلوں کے علاوہ چند دیگر اصناف پر مشتمل اشعار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے احکام الصلواۃ، واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہ سرد، شمع محفل، واقعات درد جیسی

تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جو اُن کے علمی کمالات کا مظہر ہیں۔

دردؔ کا شمار اردو کے عظیم کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تصوّف اور عرفانیات سے متعلق مضامین باندھے ہیں جس کے باعث انھیں اردو کا ممتاز صوفی شاعر مانا جاتا ہے، لیکن اُن کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں عشق مجازی کا رنگ موجود ہے، لیکن چوں کہ کثرت ایسے اشعار کی ہے جو صوفیانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لیے انھیں صوفی شاعر ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ دردؔ کی زبان میں سلاست، روانی اور سادگی ہے، لیکن اُن کے یہاں شعریت کی کمی نہیں ہے۔ دردؔ کو اپنے عہد میں بھی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور آج بھی اُن کی عظمت مسلم ہے۔

(I)

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ ، فریاد ، آہ اور زاری   آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی   ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی   دردؔ کو قصہ مختصر دیکھا

(II)

گلیمِ بختِ سیہ سایہ دار رکھتے ہیں   یہی بِساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ!   سب اہلِ قبر اسی کا خُمار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر   مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
فلک! سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری   یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں
نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیماب   وہ کچھ ہیں ، پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا   اگر چہ دردؔ اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

(III)

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم   بہار باغ تو یوں ہی رہی ، لیکن کدھر شبنم
ہمیں تو باغ تجھ بن ، خانۂ ماتم نظر آیا   ادھر گل پھاڑ تے تھے جیب روتی تھی اُدھر شبنم
کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی   ہوئی آتش سے گل ، کی بیٹھتے رشکِ شرر شبنم
بھلا ٹک صبح ہونے دو ، اِسے بھی دیکھ لیویں گے   کسی عاشق کے رونے سے ، نہیں رکھتی خبر شبنم

نہ سمجھا دردؔ ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

معنی اور اشارے:

گلیم	کملی، کمبل
بخت	قسمت
مستعار	مانگی ہوئی
خمار	نشہ
ملکیت	چادر، جائداد
اضطرار	بے قراری
برق	بجلی
چشم تر ہونا	رونا
جستجو	کوشش
تلاش	تمنا
تر دامنی	بھیگا ہوا دامن
روبرو	سامنے
ہوس	خواہش
فلک	آسمان

معروضی سوالات:

1۔ خواجہ میر درد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(i) 1721 دہلی (ii) 1718 بنارس

(iii) 1715 لکھنؤ (iv) 1710 کانپور

2۔ دردؔ کا پورا نام کیا تھا؟

(i) حیدر علی (ii) خواجہ میر

(iii) اسداللہ خاں (iv) مرزا محمد رفیع

3۔ ”جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا/تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا“ یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

(i) مرزا غالبؔ (ii) میر تقی میرؔ

(iii) خواجہ میر دردؔ (iv) فانیؔ بدایونی

4۔ خواجہ میر دردؔ کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

(i) 1785 دہلی (ii) 1760 لکھنؤ

(iii) 1780 بنارس (iv) 1740 آگرہ

مختصر ترین سوالات:

1۔ خواجہ میر درد کا تخلص کیا تھا؟

2۔ خواجہ میر دردؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

3۔ خواجہ میر دردؔ شاعر کے ساتھ ساتھ کیسے انسان تھے؟

مختصر سوالات:

1۔ ''واردات'' کے مصنف کون ہیں؟

2۔ خواجہ میر دردؔ کی تصنیفات کے نام بتائیے۔

3۔ خواجہ میر دردؔ کے زیادہ اشعار کس رنگ کے ہیں؟

4۔ دردؔ کی شاعری کی خاص خوبی کیا ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ خواجہ میر دردؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

2۔ دردؔ کی حالاتِ زندگی پر ایک نوٹ لکھئے۔

(2)

میر تقی میر

[پیدائش 1722ء، وفات 1810ء]

نام محمد تقی اور میؔر تخلص تھا۔ 1722/23ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد علی ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے جو اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کے سبب علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ میؔر نے اپنے بچپن کا زمانہ آگرہ میں گزارا۔ لیکن والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں دلی چلے گئے۔ وہاں کچھ دنوں تک پریشان رہے۔ اسی دوران ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوئی جنھوں نے انھیں اپنے چچا صمصام الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جنھوں نے اُن کی پریشانی کا خیال رکھتے ہوئے انھیں ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر کردیا، لیکن جب نادر شاہ کے حملے میں صمصام الدولہ زخمی ہوئے اور 1793 کو وفات پاگئے تو ان کا وظیفہ بند ہوگیا اور انھیں لوٹ کر آگرہ آنا پڑا۔ اس وقت دلی کے

حالات نہایت ہی خراب تھے، لیکن جب وہاں کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو وہ دوبارہ دلّی پہنچے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزؔو کے یہاں قیام پذیر ہوئے لیکن ایک روز شام کے کھانے کے وقت اُن کی تلخی ہوئی اور وہ خان آرزؔو کا مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ دلی میں ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد تلاش معاش کے سلسلے میں لکھنؤ چلے گئے جہاں نواب آصف الدولہ نے اُن کی قدر دانی کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن کسی بات پر ناراض ہو کر انھوں نے دربار کو چھوڑ دیا اور نہایت ہی تنگدستی کے عالم میں زندگی کے آخری دن گزارے۔ 1810 میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

میرؔ اردو کے عظیم شاعر ہیں اور اُن کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں انھیں ''خُدائے سخن'' کے لقب سے نوازا گیا۔ میرؔ نے اردو شاعری کو مرتبہ کمال تک پہنچایا۔ ان کے چھ دیوان اردو میں اور ایک دیوان فارسی میں موجود ہیں۔ جن میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی ان کا کلام ملتا ہے، لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور یہی صنف اُن کی جداگانہ شناخت کا وسیلہ ہے۔ میرؔ نے اپنی غزلوں میں تصوّف اور اخلاق کے مضامین بھی باندھے ہیں، لیکن عشقیہ جذبات وخیالات پر زیادہ زور صرف کیا ہے اور اسی قبیل کی شاعری کے لیے وہ مشہور ہیں۔ اُن کے اشعار میں رنج وغم کی کیفیات بکثرت پائی جاتی ہیں، اس لیے اُن کو غم کا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اُن کی زبان سادہ اور سلیس ہے لیکن اُن کے اشعار میں معنوی تہہ داری موجود ہے۔ اُن کا کلام اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

(I)

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
داغ آنکھوں سے کُھل رہے ہیں سب　　ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا　　آج دامن وسیع ہے اس کا
تاب کس کو جو حال میرؔ سُنے　　حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

(II)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا　　لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن　　جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں　　سو وہ مدّت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش　　گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ　　بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم　　پر سخن تا بلب نہیں آتا
دور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(III)

بے کلی ، بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدّت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرضِ عشق کا علاج نہیں
شہر خوبی کو خوب دیکھا میرؔ جنس دل کا کہیں رواج نہیں

(IV)

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو پھر مر بھی جایئے تو کسی کو خبر نہ ہو
دل پر ہوا سو آہ کے صدمے سے ہوچکا ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑے جگر نہ ہو
سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپانے سے خوش نگاہ مدّ نظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہ ہو
اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغان سب اس تیرہ روز گار میں تو میرؔ اگر نہ ہو

معنی اور اشارے:

منھ تکنا	حیرت سے دیکھنا
جس تس	ہر ایک کا
حیرتی	حیرت میں ہے۔[اگر آئینہ کو دل فرض کیجیے تو کہہ سکتے ہیں کہ دل نے معشوق حقیقی کا جلوہ کبھی دیکھا تھا، تب سے حیرت میں ہے اور ہر آتے جاتے کا منہ تکتا ہے۔
زخم کھلنا	زخم نمایاں ہونا
ابر	بادل
چشم تر	نم آنکھ
وسیع	فراغ، کشادہ
تاب	طاقت، برداشت، رونق، روشنی
ہوش جانا	عقل گم ہونا
رخصت	چلے جانا
گریہ	رونا، زاری
مونس	غم خوار، ہمدرد
ہجراں	جدائی
ڈھب	طریقہ
ہمدم	دوست
سخن	بات

احتیاج	حاجت،ضرورت
نالہ	فریاد،شور،فغاں
مدّنظر	نظر کے سامنے،ارادہ،قصد

معروضی سوالات:

1۔ میر تقی میرؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(i) 1780 دہلی (ii) 1722 آگرہ

(iii) 1775 کانپور (iv) 1730 لکھنؤ

2۔ میر تقی کا تخلص کیا تھا؟

(i) غالبؔ (ii) مومنؔ

(iii) میرؔ (iv) دردؔ

3۔ میرؔ کی کیا عمر تھی جب ان کے والد کا انتقال ہوا؟

(i) 11 برس (ii) 10 برس

(iii) 15 برس (iv) 7 برس

4۔ میر تقی میرؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

(i) 1810 لکھنؤ (ii) 1815 دہلی

(iii) 1825 کانپور (iv) 1830 بریلی

مختصر ترین سوالات:

1۔ میرؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

2۔ میرؔ کا بچپن کہاں گزرا؟

3۔ میرؔ کے کلام کی خوبی کیا تھی؟

مختصر سوالات:

1۔ میر تقی میرؔ کے والد کیسے انسان تھے؟

2۔ میر تقی میرؔ کو کس لقب سے نوازا گیا؟

3۔ میر تقی میرؔ کے اردو میں کتنے دیوان ہیں؟

تفصیلی سوالات:

1۔ میر تقی میرؔ کی حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

2۔ میرؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ میرؔ کی شاعری درد وغم کی شاعری ہے۔ مثالوں سے واضح کیجیے۔

(3)

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

[پیدائش 1797ء ، وفات 1869ء]

مرزا اسداللہ خاں نام اور تخلص غالبؔ تھا۔ ابتدا میں اسدؔ تخلص فرماتے اور اس تخلّص سے بھی اُن کے دیوان میں غزلیں موجود ہیں۔ اُن کے والد کا نام عبداللہ بیگ تھا جو پیشہ سے سپاہی تھے۔ غالب کی والدہ عزت النسا بیگم خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی تھی۔ غالب 27/دسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس کے بعد چچا نصراللہ بیگ نے آپ کی کفالت کی۔ 1810ء میں آپ کی شادی مرزا الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوگئی اور آگرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وہ دلّی چلے گئے۔ 1850ء میں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ بادشاہ نے 'نجم الدولہ'، 'دبیر الملک' اور 'نظام جنگ' خطابات سے نوازا اور خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت سونپی۔

اس کے لیے 50 روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ 15 رفروری 1869ء کو انتقال کیا اور بستی حضرت نظام الدین اولیا میں مدفون ہوئے۔

غالبؔ ایک عظیم شاعر وادیب تھے۔ انھوں نے نظم ونثر دونوں میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ اردو میں ایک دیوان کے علاوہ 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' خطوط کے مجموعے ہیں۔

غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا جس کا اظہار انھوں نے اس انداز میں کیا ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بہ گذراز مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن اُن کی شہرت اور مقبولیت کا سبب اردو شاعری بنی۔ غالبؔ نے اردو شاعری میں اپنی راہ آپ نکالی اور اپنے منفرد اسلوب سے اردو غزل میں امتیازی شان قائم کی۔ غالبؔ کی غزلیں فکر وفلسفہ سے معمور ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں سطحی جذبات کی ترجمانی نہیں کرتے جس کی وجہ سے اُن کی غزلیں ہمیں دعوتِ غور وفکر دیتی ہیں۔ نادر تشبیہات واستعارات اور معیاری زبان وبیان نے غالبؔ کی عظمت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ غالبؔ ایک مشکل پسند شاعر ہیں اور ان کی مشکل پسندی زبان کی سطح سے لے کر معنوی سطح تک پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اُن کے بعض اشعار پر اہمال کا بھی گمان گزرتا ہے، لیکن غور وفکر کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے یہ اشعار مہمل نہیں بلکہ دقیق ہیں جس کی معنوی تہہ تک پہنچنے کے لیے کافی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں ، حرم نہیں ، در نہیں ، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

(II)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بے داد گر کو میں

غالبؔ خُدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں!

معنی واشارے:

سنگ	پتّھر
خشت	اینٹ
دیر	مندر
حرم	مسجد
رہ گزر	عام راستہ، سڑک
حیات	زندگی
غم	رنج، تکلیف
نجات	چھٹکارہ، رہائی
وفا پرست	وفادار، مخلص
خستہ	بدحال، مفلس، تنگدست
مقدور	طاقت، قدرت
نوحہ گر	رونے اور رلانے والا
بے ننگ و نام	بدچلن، بدوضع، بدکردار
تیز رو	تیز رفتار
راہ بر	راستہ بتانے والا، رہنما
احمق	نادان، بے وقوف، بدعقل
پرستش	عبادت

سمند	گھوڑا
گہر	موتی

معروضی سوالات:

1۔ غالبؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(i) 1797 آگرہ   (ii) 1780 دہلی

(iii) 1800 لکھنؤ   (iv) 1805 کانپور

2۔ مرزا غالبؔ اپنا تخلص غالبؔ کے علاوہ اور کیا لکھتے تھے؟

(i) میرؔ   (ii) اسدؔ

(iii) امیرؔ   (iv) دردؔ

3۔ غالبؔ کی وفات کب ہوئی؟

(i) 1870   (ii) 1869

(iii) 1850   (iv) 1865

مختصر ترین سوالات:

1۔ غالبؔ کس مغل بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے؟

2۔ غالب کو کس زبان کی شاعری پر ناز تھا؟

3۔ غزل کے پہلے شعر کو کیا کہتے ہیں؟

4۔ غالبؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

مختصر سوالات:

1۔ غالبؔ کو شہرت اور مقبولیت کس شاعری سے ملی؟

2۔ غالبؔ کے کتنے دیوان ہیں؟

تفصیلی سوالات:

1۔ مرزا غالبؔ کی غزل گوئی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ مرزا غالبؔ کے حالات زندگی کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

3۔ غالبؔ کی عشقیہ شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔

(4)

امیرؔ مینائی

[پیدائش 1826ء، وفات 1900ء]

امیرؔ مینائی کا پورا نام امیر احمد مینائی تھا۔ امیرؔ تخلص فرماتے۔ 1826ء کو لکھنؤ میں پیدائش ہوئی۔ مینائی نام کا جزو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب شاہ مینا تک پہنچا۔ مزاج میں صبر و متوکل تھا اور تصوف ان کا خاصی میلان تھا۔ فرنگی محل، لکھنؤ میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مفتی سعد اللہ ان کے استاد رہے۔ 1853ء میں واجد علی شاہ کی ملازمت میں گئے اور انھیں دو کتابیں 'ارشاد السلطانی' اور 'ہدایت السلطانی' لکھ کر پیش کیں۔ جب غدر کا دور شروع ہوا تو حالات ابتر ہوتے گئے اور کچھ وقت تو امیرؔ اپنے دوست محسنؔ کاکوروی کے گھر رہے۔ پھر نواب علی خاں ناظم نے رامپور بلا لیا جہاں وہ مفتی مقرر ہوئے۔ ناظم کی وفات کے بعد کلب علی خاں نے انھیں (216) دوسو سولہ روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا اور اس وقت جب داغؔ، بحرؔ، جلالؔ وغیرہ شعرا کی بڑی اہمیت تھی ایسے ہی ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امیرؔ مینائی نے اپنی شاعری کو جلا بخشی۔

رامپور میں شعری مقابلے میں امیر مینائی کے جواہر اور بھی کھلے۔ امیرؔ کے یہاں زبان کی صفائی، محاورے کا استعمال، روزمرہ کے الفاظ کو ایک خاص ڈھنگ سے برتنے کا انداز، شعری گھلاوٹ وغیرہ ہے۔ ان کی غزلوں میں اکہرا انداز نہیں ملتا۔ تشبیہ و استعارے کے استعمال میں خاصی ہنرمندی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ نسوانی آرائش و جمال ان کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں شوخی ہے لیکن اس کے باوجود وہ سطحیت اختیار نہیں کرتے۔ امیرؔ کے یہاں عشق و عاشقی میں وہ تمکنت ملتی ہے جو صوفیا کا حصہ ہے۔ ان کی تصانیف میں دو دیوان 'مرآۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' بہت

مشہور ہیں۔ 'گوہر انتخاب' اور 'جوہر انتخاب' بھی شعری انتخاب ہیں۔ امیرؔ مینائی نے واسوخت اور مثنویاں بھی کہی ہیں۔ 'مضامین دل آشوب' اور 'مجموعہ واسوخت' مشہور ہیں۔ 'ابر کرم'، 'لیلۃ القدر'، 'شام اودھ'، 'نورِ تجلّی' وغیرہ ان کی مشہور مثنویاں ہیں جن کا رنگ بیحد مذہبی ہے۔ فارسی میں ایک دیوان اور ایک نعتیہ دیوان 'محامد خاتم النبیین' بھی ہے۔ ایک لغت بھی 'امیر اللغات' معروف ہے۔ 1900ء میں حیدرآباد میں وفات ہوئی۔

بہرطور، امیرؔ مینائی ایک ایسے شاعر ہیں جن کا ذکر داغؔ کے بعد ہر جگہ موجود ہے۔

(I)

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا　　لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

بے تعلق کیا ہمیں اس کے تصور نے کیا　　جب جھکایا سر گریباں اپنا خلوت خانہ تھا

باغ عالم کا تماشا باعث غفلت ہوا　　دیکھنا آنکھوں کا کانوں کے لیے افسانہ تھا

اس قدر اس کے تصور نے ستایا ہے مجھے　　شبہ ہوتا ہے کہ ہستی میں کبھی تھا یا نہ تھا

آزما دیکھا اسے سو بار ہم نے اے امیرؔ

آشنا سے آشنا بیگانے سے بیگانہ تھا

(II)

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر　　سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

کوہ کن! کوہ کنی شیوۂ عشّاق نہیں　　ہے جو عاشق ، دلِ معشوق میں گھر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا　　نکہتِ گل کی طرح شوق سفر پیدا کر

قطرۂ اشک بنے گوہر گوش جاناں　　آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر

آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے

پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر

(III)

مے پئیں کیا کہ کچھ فضا ہی نہیں ساقیا باغ میں گھٹا ہی نہیں
خضر کیا جانیں مرگ کی لذت اس مزے سے وہ آشنا ہی نہیں
کس طرح جائیں ان کی محفل میں جن کے دل میں ہماری جا ہی نہیں
کیا سنیں گے وہ خلق کی فریاد کہتے ہیں جو کوئی خدا ہی نہیں
مرنے والوں سے کہتے ہیں وہ امیرؔ
کیا تمھاری کبھی قضا ہی نہیں

معنی اور اشارے:

حسن مطلق	خالص اور کامل حسن، حسن تمام جس پر اضافے یا جس میں تخفیف ممکن نہ ہو، ذات باری تعالیٰ جس کو عدم نہ ہو، آغاز اور زوال نہیں۔
ازل	وہ زمانہ جس کی کوئی ابتدا نہ ہو۔ آغاز
لامکاں	وہ جو مکان یا جگہ کے بغیر ہو، وہ جو مکان سے پرے ہو یعنی خدا۔
کاشانہ	تنہائی کی جگہ، علیٰحدگی کا مقام
غفلت	بھول چوک، غلطی، لاپرواہی، اونگھ، بے ہوشی
آشنا	شناسا، جان پہچان والا، ملاقاتی، واقف کار
ہوس	لالچ
سرفروشی	جان بازی، جان قربان کرنا، سر کٹانا
کوہ کن	پہاڑ کھودنے والا، فرہاد کا لقب
کوہ کنی	پیاڑ کھودنا
نکہت	خوشبو، مہک
گوہر	موتی، جواہر
گوش	کان
خضر	ایک پیغمبر جن کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے آب حیات پیا ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ رہنما، رہبر
مرگ	موت

محفل	مجلس، جلسہ، انجمن، سبھا
جا	جگہ، مقام، ٹھکانہ
خلق	خلقت، دنیا کے لوگ مخلوق
قضا	موت، تقدیر، حکمِ خدا، وہ عبادت جو مقررہ وقت کے بعد ادا کی جائے۔

معروضی سوالات:

1۔ امیرؔ مینائی کی ولادت کب ہوئی ؟

(i) 1826 (ii) 1835

(iii) 1854 (iv) 1832

2۔ 'مرآۃ الغیب' کس شاعر کا دیوان ہے؟

(i) داغؔ (ii) آتشؔ

(iii) دردؔ (iv) امیرؔ مینائی

3۔ 'امیر اللغات' کس کی تخلیق ہے؟

(i) امیر خسرو (ii) امیرؔ مینائی

(iii) داغؔ (iv) محسن کاکوروی

4۔ امیر مینائی کی وفات کس شہر میں ہوئی ؟

(i) لکھنؤ (ii) حیدرآباد

(iii) دہلی (iv) آگرہ

5۔ 'ابرِ کرم' اور 'نورِ تجلّی' کس کی مشہور مثنویاں ہیں؟

(i) محسنؔ کاکوری (ii) سوداؔ

(iii) ذوقؔ (iv) امیرؔ مینائی

مختصر ترین سوالات:

1۔ امیر مینائی کہاں پیدا ہوئے؟

2۔ امیر مینائی کا تخلص کیا تھا؟

3۔ لکھنؤ سے امیر مینائی کس شہر گئے؟

4۔ امیر مینائی کی وفات کس سن میں ہوئی؟

5۔ تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر۔۔۔۔ شعر مکمل کیجئے۔

مختصر سوالات:

1۔ حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا/ لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

درج بالا شعر کس کا ہے؟ مع سیاق وسباق تشریح کیجئے۔

2۔ امیرؔ مینائی کی مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیجئے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ امیرؔ مینائی کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ کوہ کن! کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں/ ہے جو عاشق، دلِ معشوق میں گھر پیدا کر

درج بالا شعر میں کون سی صنعت ہے؟ تعریف مع مثال بیان کیجئے اور تشریح کیجیے۔

(5)

پنڈت برج نرائن چکبست

[پیدائش 1882ء، وفات 1926ء]

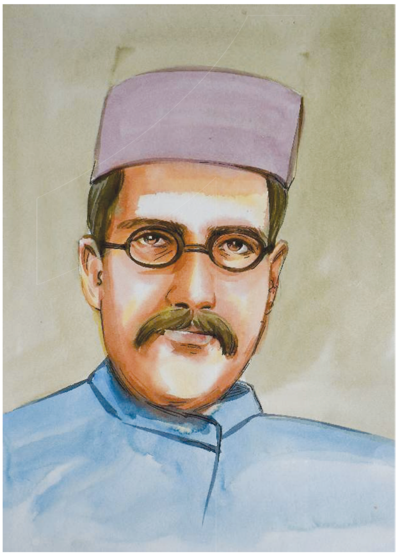

پنڈت برج نرائن چکبست کی پیدائش 19 رجنوری 1882ء میں فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے آبا واجداد کشمیری برہمن تھے۔ وہ ایک علمی وادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والد پنڈت اودے نرائن چکبست ڈپٹی کلکٹر تھے اور شعر گوئی کا بھی شوق رکھتے تھے، شاعری میں یقینؔ تخلص فرماتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے بعد انھوں نے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ وکالت اور شاعری دونوں میں خوب خوب نام کمایا۔ محض چوّالیس برس کی عمر میں 12 رفروری 1926ء کو رائے بریلی میں ان کی وفات ہوگئی۔ چکبستؔ نے قلیل مدت میں ہی شاعری کے میدان میں اپنی پہچان بنالی اور ان کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔

چکبستؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور اُن کی نظموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، لیکن غزل گوئی میں بھی اُن کا رتبہ کم نہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں حُسن وعشق کے فرسودہ اور روایتی مضامین سے احتراز کرتے ہوئے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو جگہ دی اور شاعری کو فلسفۂ حیات وکائنات بنا دیا۔ وہ ایک روشن خیال شاعر تھے اور زندگی کے رموز وحقائق پر اُن کی نظر تھی جس کا برملا اظہار اُن کی غزلوں میں ہوا ہے۔ ان کی زبان معیاری ہے۔ سادگی، سلاست اور روانی کی وجہ سے اُن کی غزلوں میں ترنم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں دبستان لکھنؤ کی عام روایت کی پیروی نہیں کرتے اور اپنی شاعری کو آفاقی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(I)

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

وہ طبع یاس پرور نے مجھے چشم عقیدت دی
کہ شام غم کی تاریکی کو بھی نور سحر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

چمن زار محبت میں اسی نے باغ بانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بے کار ہے تنگ آکے اس دنیا سے مر جانا

(II)

نہیں منظور جینا روشناسِ چارہ گر ہوکر
رہے گا پاس غیرت پردۂ زخم جگر ہوکر

قفس کی آڑ سے محروم ہیں ہم آشیاں کیسا
پڑے ہیں دور صحنِ باغ سے بے بال و پر ہوکر

عدم سے آئے تھے دنیا میں کیا معلوم تھا ہم کو
رہے گا ساتھ سودا زندگی کا دردِ سر ہوکر

مقدر دیکھنا شبنم کا پھولوں میں ہوئی پیدا
پیام آیا فنا کا ، جلوۂ نورِ سحر ہو کر

یہی اک راستہ باقی تھا کیا اوج مراتب کا
بنے اہل نظر تم دشمن اہل ہنر ہو کر

(III)

شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے　　کچھ سمجھ کر ہم شریکِ بزم رنداں ہو گئے
دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے　　خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے
رہ گئی بازار محشر میں گنہ گاروں کی ساکھ　　رحمت باری کے سکّے داغِ عصیاں ہو گئے
اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار　　سبزۂ و گل صحنِ زنداں میں نمایاں ہو گئے
اس تمنا میں کہ آزادی کی دیکھیں گے سحر　　ہم اسیرِ کلفت شب ہائے زنداں ہو گئے

جام تک خُم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہو گئے

معنی اوراشارے:

اجل	موت
برگ	پتی
ثمر	پھل
سودا	دیوانہ،جنون
یاس پرور	دکھ کو بڑھانے والا ،نا امیدی پیدا کرنے والا
قفس	پنجرہ،قید
عدم	نہ ہونا،نیستی
اوج	اونچائی، بلندی
مراتب	مرتبہ کی جمع
شورش	فتنہ،فساد، بلوہ، ہنگامہ
اکسیر	وہ شے جوتانبے کوسونا اور رانگے کو چاندی بنادے، لازمی اثر کرنے والی دوا
محشر	قیامت،میدان حشر
عصیاں	گناہ
کلفت	رنج،تکلیف، کدورت، رنجش
ساقی	شراب پلانے والا

معروضی سوالات:

1۔ برج نرائن چکبستؔ کی سن پیدائش کیا ہے؟

(i) 1882ء
(ii) 1885ء
(iii) 1888ء
(iv) 1890ء

2۔ چکبستؔ کے والد شاعری میں کیا تخلص کرتے تھے؟

(i) شوقؔ
(ii) یقینؔ
(iii) تاباںؔ
(iv) گویاؔ

3۔ چکبستؔ کس عمر میں فوت ہوئے؟

(i) چالیس برس
(ii) اکتالیس برس
(iii) چوّالیس برس
(iv) پچاس برس

4۔ ''دیر وحرم'' کے کیا معنی ہیں؟

(i) درودیوار
(ii) زمین وآسمان
(iii) موت وزندگی
(iv) مندرومسجد

5۔ لفظ 'اوج مراتب' کے معنی کیا ہے؟

(i) اپنا پرایا
(ii) زندگی موت
(iii) دن رات
(iv) اونچا مرتبہ

مختصر ترین سوالات:

1۔ چکبستؔ کا پورا نام کیا ہے؟

2۔ چکبستؔ کی ولادت کب ہوئی؟

3۔ چکبستؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

تفصیلی سوالات:

1۔ چکبستؔ کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کیجئے۔

2۔ چکبستؔ کی حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیں۔

3۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح مع سیاق وسباق کیجئے۔

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سَر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

عزیزان وطن کو غنچہ وبرگ و ثمر جانا
خدا کو باغ باں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا
تو پھر بے کار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

(6)

فانؔی بدایونی

[پیدائش1879ء،وفات1941ء]

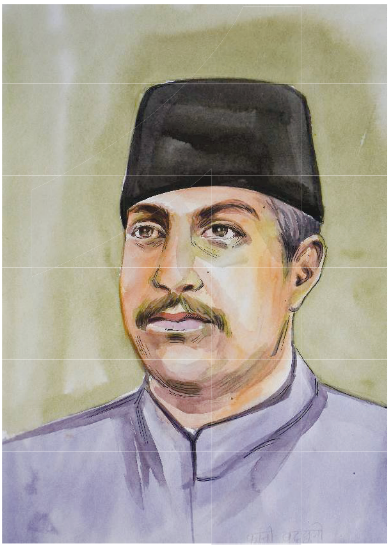

جدید اردو غزل میں فانؔی بدایونی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔1879ء میں ضلع بدایوں کی ایک تحصیل اسلام نگر میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ دھیرے دھیرے معاشی حالات بگڑنے لگےان کے والد شجاعت علی خاں کو پولس میں ملازمت کرنی پڑی۔ فانؔی نے جب ہوش سنبھالا تو جو کچھ رہا سہا تھا جاتا رہا۔ بدایوں سے ہائی اسکول کیا۔ بریلی کالج سے بی۔اے۔اور محمڈن کالج سے ایل ایل بی کی تکمیل کی۔شعر وشاعری سے ان کا فطری لگاؤ تھا،لیکن ان کے والد ہمیشہ ان کو شعر گوئی سے روکتے تھے۔ فانی کا پہلا دیوان انھوں نے نذر آتش کر دیا۔اس کے بعد نہایت ہی پوشیدہ طور پر شعر کہتے تھےاوران کو کسی سے اصلاح لینے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

فانؔی نے تین دیوان تین مثنویاں اور دو ڈرامے بھی لکھے۔ جو کچھ رہ گیا وہ باقیات فانؔی کے نام سے شائع ہوا۔ 'باقیات فانؔی' کے بعد جدید وقدیم رنگ کے کلام کا ایک نیا مجموعہ ''عرفانیات فانی'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قطعات ورباعیات میں جدّت بیان سے کام لیا ہے۔ ان کے کلام کی خاص خوبی ''اثر'' اور معنویت ہے، اس سے ان کے کلام کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔

1932ء میں مہاراجہ کشن پرشاد نے حیدرآباد بلایا دربار سے وابستہ رہنے کے ساتھ ہی وہ ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے۔ دکن میں جاکر بھی ان کو خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ 26/اگست 1941ء کو فانؔی کا انتقال ہوگیا۔

فانؔی کا شمار اردو کے ممتاز غزل گوشعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت احساس کی شدّت، دور انگیزی اور خیال کی گہرائی ہے۔ انھوں نے حسن وعشق کو بھی موضوع بنایا، تصوف ومعرفت کے مضامین بھی باندھے لیکن ان کے کلام کا اصل موضوع غمِ حیات ہے۔ ان کی شاعری یاس وناکامی، ومحرومی ونامرادی اور رنج والم سے عبارت ہے۔ فانؔی کی غزلیں ان کی زندگی کی ترجمان ہیں۔ موت ان کے یہاں محبوب کی حیثیت رکھتی ہے جو ان کی ناکامی ونامرادی اور سارے غموں کا علاج ہے۔ وہ اپنی شاعری میں فنّی تقاضوں کا خاص خیال رکھتے ہیں اور لفظوں کے انتخاب کے حسن ترتیب اور تراش خراش کی طرف توجہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے کلام میں ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

(I)

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہے کوہے خواب ہے دیوانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا
ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانؔی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

(II)

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور
شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ہے منع راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور
تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور
فانؔی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

(III)

وہ ہی وہ ہیں مگر ظہور نہیں   اس طرح دور ہیں کی دور نہیں
کچھ ہمیں کو یہ زندگی ہے عزیز   ان کی بے داد کا قصور نہیں
گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا   دل ہے بندہ نواز ، طور نہیں
تم پہ مرنا جنھیں نہیں آتا   زندگی کا انھیں شعور نہیں
ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور   بات کی بات ہے غرور نہیں
ترک دنیا نہ ہو سکے تو نہ کر   غم دنیا مگر ضرور نہیں

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانؔی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

معنی اور اشارے:

خلق	دنیا کے لوگ
پشیماں	شرمندہ
حیلہ	بہانہ
نفس	سانس
معمّا	پہیلی
دیر وحرم	مندر و مسجد
ظہور	ظاہر کرنا
قصور	خطا
شعور	سلیقہ
عقدہ	گتّھی
عمر گزشتہ	گزری ہوئی زندگی
درخور نگہِ کرم	نگاہِ کرم کے قابل
بے داد	ظلم، ستم
طور	ایک پہاڑ جہاں حضرت موسیٰؑ نے جلوہ الٰہی کا نظارہ کیا تھا

معروضی سوالات:

1۔ فانؔی کا بچا ہوا کلام کس نام سے شائع ہوا؟

(i) باقیاتِ فانی (ii) حیاتِ فانی

(iii) کلامِ فانی (iv) نظرِ فانی

2۔ فانؔی نے کتنے ڈرامے لکھے؟

(i) چار (ii) دو

(iii) آٹھ (iv) چھ

3۔ فانؔی کا انتقال کب ہوا؟

(i) 26/اگست 1941 (ii) 15/اگست 1942

(iii) 26/جنوری 1972 (iv) 15/جنوری 1973

4۔ فانؔی کے جدید وقدیم رنگ کے کلام کا نیا مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟

(i) عرفانیاتِ فانی (ii) سماجیاتِ فانی

(iii) اخلاقیاتِ فانی (iv) عمرانیاتِ فانی

5۔ فانؔی نے کتنی مثنویاں لکھیں؟

(i) دو (ii) تین

(iii) پانچ (iv) چھ

مختصرترین سوالات:

1۔ فانؔی کب پیدا ہوئے؟

2۔ فانؔی نے ہائی اسکول کہاں سے کیا؟

3۔ فانؔی نے ایل ایل بی کس کالج سے کیا؟

4۔ فانؔی کے والد کا کیا نام تھا؟

مختصر سوالات:

1۔ فانؔی نے کس صنف میں سب سے زیادہ شہرت پائی؟

2۔ فانؔی کے شعری اسلوب پر روشنی ڈالئے۔

تفصیلی سوالات:

1۔ فانؔی کے حالات زندگی بیان کیجئے۔

2۔ فانؔی کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجئے۔

(7)

اصغرؔ گونڈوی

[پیدائش 1884ء، وفات 1936ء]

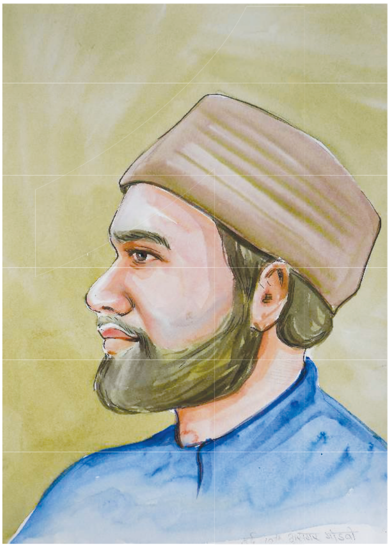

دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں اصغر گونڈوی کا نام سرِ فہرست ہے۔ اصغرؔ کا اصلی وطن گورکھپور تھا۔ لیکن ان کے والد نوکری کے سلسلے میں کافی عرصہ تک گونڈہ میں رہے اس لیے آپ گونڈوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اصغرؔ 1884ء میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں داخل ہوئے۔ گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا۔ اپنے ذاتی مطالعے سے اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ انگریزی، عربی اور فارسی ادب کا لطف لے سکے۔

اصغرؔ ابتدا میں اپنا کلام منشی خلیل احمد وجدؔ بلگرامی کو دکھاتے رہے بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں۔ الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کی ملازمت کے سلسلے میں قیام رہا اور اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے ''ہندوستانی'' کے ایڈیٹر

رہے۔

اسلوب کے لحاظ سے اصغؔر کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ آپ کی انفرادیت آپ کی شاعری کا راز ہے۔ بیان کے اسلوب کے لحاظ سے اصغؔر اردو کے تمام شعرا سے الگ ہیں، ان کے اشعار سن کر ایک خاص قسم کا لطف آتا ہے۔ اصغؔر عشق کی منزلیں بغیر آہ و فغاں کے طے کر لیتے ہیں۔ اصغؔر کی غزلوں میں سوز و گداز ہے مگر ان کے سوز و گداز میں آہ و بکا نہیں ہے۔

اصغؔر کے کلام کے دو مجموعے ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' شائع ہوئے۔ ان کا دیوان ''نشاطِ روح'' ان کی ابتدائی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ ''نشاطِ روح'' نے اردو غزل میں نئی روح پھونکی۔ اصغؔر کے کلام میں سب سے پہلی چیز لب و لہجہ کی وہ جدّت آمیز رنگینی ہے جو پڑھنے والوں اور سننے والوں کو ایک خوشگوار طریقے سے متاثر کر دیتی ہے۔ دوسری چیز سکون و اضطراب کی آمیزش ہے جو ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ تصوّف اور معرفت کے مضامین کو سرور کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اصغؔر کا انتقال 1936ء میں الہ آباد میں ہوا۔

اصغؔر نہایت محنت سے شعر کہتے تھے۔ آپ کسی کے مقلد نظر نہیں آئے، آپ کی انفرادیت آپ کی شاعری کا راز ہے۔ بیان کے اسلوب کے لحاظ سے اصغؔر اردو کے تمام شعرا سے الگ ہیں۔ اصغؔر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات وخیالات کو ایک خاص انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

(I)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کُشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں، تو تعمیر عشق کی جب خاک کر دیا اسے عِرفاں بنا دیا
وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

(II)

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
کبھی گُل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں
یہی تھوڑی سی مے ہے اوریہی چھوٹا سا پیمانہ اسی سے رند راز گنبد مینا سمجھتے ہیں
کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر کبھی ذرّے میں گم ہو کر اسے صحرا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی ، یہ ارزانی ، یہ عریانی پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردہ سمجھتے ہیں
زمانہ آ رہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغرؔ
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

(III)

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں　　صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہور میں
حسنِ کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے　　جان بلا کشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں
اس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اچھال کر　　آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برق طور میں
خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں　　اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں
تیری ہزار برتری ، تیری ہزار مصلحت
میری ہراک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

معنی اور اشارے:

آلام	پریشانیاں
لب کشا	ہونٹ کھلنا، بات کرنا
بسیط	بچھا ہوا، کشادہ
روزگار	زمانہ
غمِ جاناں	محبوب کا غم
گلستاں	چمن
زنداں	قید خانہ، جیل
شورشیں	وہ عناصر جس سے دنیا بنی ہے
نیشتر	چبھنے والا

مختصر ترین سوالات:

1۔ اصغرؔ کب پیدا ہوئے؟

2۔ اصغرؔ کا اصلی وطن کیا تھا؟

3۔ اصغر کا انتقال کب ہوا؟

مختصر سوالات:

1۔ اصغرؔ کے کلام کے مجموعوں کے نام بتایئے۔

2۔ اصغرؔ کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟

تفصیلی سوالات:

1۔ اصغرؔ گونڈوی کے غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجئے۔

2۔ درج ذیل غزل کی تشریح کیجئے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا

(8)

اسرارالحق مجاؔز

[پیدائش 1911ء، وفات 1955ء]

اسرارالحق مجاؔز ضلع بارہ بنکی کے قصبہ رودولی میں 1911ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1936ء میں بی۔ اے کیا۔ یہ وہی دور تھا جب ترقی پسند تحریک ملک میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ علی گڑھ میں بھی اس کا بہت چرچا تھا۔ مجاؔز بھی اس سے متاثر ہوئے اور تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد مجاؔز آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک حکومت مہاراشٹر بمبئی کے محکمہ اطلاعات سے منسلک رہے۔ پھر ''نیا ادب'' لکھنؤ کے ادارے اور ہارڈنگ لائبریری دہلی سے وابستہ رہے۔ کثرت مے نوشی کے سبب 1955ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجاؔز نے جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ایک فرسودہ نظام نظر آیا جو ملک کے لیے سازگار نہ تھا۔ انھوں نے اسے بدلنے کی خواہش شدّت سے محسوس کی اور انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ آداب شاعری کو نظرانداز کرنا اور صرف تحریک کا پرچار کرنا نفع بخش نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی لاابالی طبیعت کے باوجود مجاؔز نے شاعری کے فنّی تقاضوں کی طرف زیادہ توجہ کرنی شروع کی۔ طبیعت کا جوش اس زمانے کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں خطابت زیادہ ہے اور فنکاری کم ہے۔

مجاؔز کا پہلا مجموعہ کلام ''آہنگ'' 1938ء میں شائع ہوا جس کی کچھ نظمیں مثلاً 'رات اور ریل'، 'اندھیری رات کا مسافر'، 'آوارہ'، بہت مقبول ہوئیں۔ کچھ افسانوں کے ساتھ یہ مجموعہ 1945ء میں ''شب تاب'' کے نام سے شائع ہوا۔

ایک اور مجموعہ ''سازِنو'' کے نام سے چھپا۔

انسانی جذبات کی عکّاسی میں مجاؔز کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں معاشی مسائل کارفرما ہوں یا جذبۂ عشق، وہ اس پر گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور پورے فنّی مہارت کے ساتھ اسے شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ روحانی اور محاکاتی شاعری میں مجاؔز کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ اپنے زمانے کا نقشہ جس خوبی سے پیش کرتے ہیں اس کو دیکھ کر خود بخود جوشِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جوانی کی امنگیں اور سرمستی بھی ان کے کلام کو رنگین اور دلکش بنا دیتی ہے۔ بطور نمونہ مجاؔز کے چند شعر:

اے شوقِ نظارہ کیا کہیئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجئے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

ہمدم یہی ہے رہ گزرِ یارِ خوش خرام
گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

زیرِ درس غزلیات مجاؔز کے مجموعۂ کلام سے ماخوذ ہیں۔ مجاز کے کلام میں اساتذہ کی سی پختگی اور صناعی نہیں ملتی لیکن وہ معصومیت اور سادگی ضرور ملتی ہے جو اُن کی شاعری کو اثر انگیز بناتی ہے۔

(I)

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا ، اے سورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے ، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصوّر کیا کیجئے ، ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں ، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں ہو رخصت ، ہم لطف بہاراں بھول گئے

(II)

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم ہٹ کر چلے ہیں رہ گزر کارواں سے ہم
ہم دم یہی ہے رہ گزر یار خوش خرام گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم

(III)

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے　　دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے
ہائے انجام اس سفینے کا　　ناخدا نے جسے ڈبویا ہے
آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں　　آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے
پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

معنی اور اشارے:

سورشِ دوراں	دنیا کی ہنگامہ آرائی
دیدۂ گریاں	روتی ہوئی آنکھ
اذن	اجازت، حکم
خرام	نخرے کی چال
کہکشاں	چھوٹے چھوٹے ستاروں کی قطار
خرد	عقل، دانائی
نالہ	فریاد، فغاں
نم ناک	گیلی یا بھیگی ہوئی
سفینہ	کشتی، جہاز

معروضی سوالات:

1۔ اسرار الحق مجازؔ کس ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے؟

(i) رومانی تحریک (ii) ترقی پسند تحریک

(iii) اشتراکی تحریک (iv) حلقۂ اربابِ ذوق

2۔ مجازؔ کا مجموعہ کلام کون سا ہے؟

(i) دستِ تہِ سنگ (ii) آہنگ

(iii) فروزاں (iv) دستِ صبا

3۔ مندرجہ ذیل میں مجازؔ کی نظم کون سی ہے؟

(i) شمع اور شاعر (ii) آوارہ

(iii) ایک لڑکا (iv) خاکِ ہند

4۔ مجازؔ کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1955 (ii) 1960

(iii) 1965 (iv) 1970

مختصر ترین سوالات:

1۔ مجازؔ کہاں کے رہنے والے تھے؟

2۔ ملازمت سے قبل مجازؔ کس ادارے سے وابستہ تھے؟

مختصر سوالات:

1۔ مجازؔ کا مجموعہ کلام کب اور کس نام سے سے شائع ہوا تھا؟

2۔ دورِ حاضر کے شعراء میں مجازؔ کا کیا مقام ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ مجازؔ کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ مجازؔ کی شاعری میں کون سی خوبیاں پائی جاتی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ مجازؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

(9)

جذبی

[پیدائش 1912ء، وفات 2005ء]

اصل نام معین احسن اور جذبی تخلص ہے۔ان کی پیدائش 1912ء میں ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ مبارک پور میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی اور مزید تعلیم مختلف مقامات جیسے لکھنؤ، جھانسی، آگرہ اور دہلی وغیرہ میں حاصل کی۔اردو سے ایم۔اے کرنے کے بعد ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی۔کچھ عرصہ تک اردو ماہنامہ ''آج کل'' سے وابستہ رہے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے اور ترقی پا کر ریڈر بن گئے۔یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقل طور پر علی گڑھ میں ہی سکونت اختیار کر لی۔13/فروری 2005ء کو ان کا انتقال ہوا۔

جذبی نے شعبۂ اردو میں تدریس کے دوران ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو ''حالی کا سیاسی شعور'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''فروزاں'' اور دوسرا ''سخن مختصر'' ہے۔وسیع تجربے اور مطالعے نے کلام میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا کر دی ہے۔سماج کی طبقاتی کشمکش ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔سرمایہ داری کے خلاف اور مزدوروں کی حمایت میں انھوں نے آواز بلند کی۔ان کی آواز میں درد ہے، بیان میں سنجیدگی اور متانت کے سبب ایک ایسی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے جو ان کی قلبی کسک کی آئینہ دار ہے۔

جذبی کے کلام کا سرمایہ بہت مختصر ہے لیکن جو بھی ہے انتخاب ہے۔ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا انداز فنکارانہ ہے، وہ اپنے تجربے کو ایسے نپے تلے انداز میں ادا کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ طویل کہی جاتی تو بے لطف رہتی اور مختصر کہی جاتی تو مبہم ہو جاتی۔یہ ان کے فکر و نظر کی گہرائی اور زبان و بیان پر قدرت کا نتیجہ ہے۔جذبی اس وقت تک شعر نہیں کہتے جب تک کوئی اہم شعری تجربہ دل کے نہاں خانے سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب نہ ہو جائے۔اس

کے بعد تخلیق شعر کا اگلا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ جذبؔی اس وقت تک شعر کی تراش خراش میں مشغول رہتے ہیں جب تک وہ فن کا اچھا نمونہ نہ بن جائے۔ جذبؔی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔ محنت کشوں اور غریبوں کی حمایت میں نظمیں کہیں لیکن ان میں نعرہ بازی اور کمیونزم کی نشر واشاعت کا انداز کہیں بھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ فن کی کسوٹی پر ان کے بیشتر اشعار پورے اترتے ہے۔ نمونہ کلام:

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت یہی زندگی مسرّت
یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

زیرِ درس غزلیات معین احسن جذبؔی کے مجموعۂ کلام ''فروزاں'' سے ماخوذ ہیں۔ جذبی کی کیفیت ایک بجھے ہوئے شعلے کی سی ہے۔ ان کے کلام میں یاس انگیزی بہت ہے جو خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے لب ولہجہ میں بھی ملتی ہے۔

(ا)

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں ، وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اِک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اِک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم ان امّیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

(II)

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت ، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت ، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنّا ، کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش ، کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخیِ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں ، کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں، کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں ، کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوز شاعرانہ

معنی اور اشارے:

مشعل	چراغ دان
بحرِظلمات	تاریک سمندر
ماہ واختر	چانداور ستارے
یاس	ناامیدی
گوہر	موتی
مئے عشرت	خوشی کے آنسو
مداوا	علاج، تدبیر
آشیانہ	گھونسلہ، گھر
تلخی	کڑواہٹ، ترشی
رفعت	بلندی، ترقی
لرزاں	ہلنے والا
مہروماہ	سورج اور چاند
انجم	ستارے
اوج	اونچائی، شان
خسروانہ	شاہانہ
زاہد	متقی، پرہیز گار
سوز	مرثیہ پڑھنے کا ایک طریقہ، جلن

صوفی	اونی کپڑے پہننے والا، متّقی اور پارسا شخص
پستی	گہرائی، زوال
خائف	خوفزدہ، ڈرا ہوا
تاثیر	اثر
زد	نشانہ

معروضی سوالات:

1۔ معین احسن جذبیؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(i) جھانسی (ii) آگرہ

(iii) اعظم گڑھ (iv) بنارس

2۔ جذبی کا مجموعۂ کلام کون سا ہے؟

(i) فروزاں (ii) آہنگ

(iii) روپ (iv) بانگِ درا

3۔ جذبی کس اردو ماہنامے سے وابستہ رہے؟

(i) شمع (ii) آج کل

(iii) اردو دنیا (iv) اودھ پنچ

4۔ ''یہی زندگی مصیبت یہی زندگی مسرت/ یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ'' یہ شعر کس کا ہے؟

(i) فانی (ii) درد

(iii) جذبی (iv) مجاز

مختصر ترین سوالات:

1۔ جذبی کہاں کے رہنے والے تھے؟
2۔ جذبی کو ملازمت کہاں ملی تھی؟
3۔ جذبی کے تحقیقی مقالہ کا کیا نام ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ ملازمت سے قبل جذبی کا کس اردو ماہنامہ سے تعلق رہا؟
2۔ جذبی کے کلام کے مجموعوں کے نام بتائیے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ جذبی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے۔
2۔ جذبی کے کلام کی خصوصیات بیان کیجئے۔
3۔ جذبی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

(10)

نشوؔر واحدی

[پیدائش 1912ء، وفات 1983ء]

نشوؔر واحدی کا اصل نام **حفیظ الرحمٰن** تھا۔ ان کی **پیدائش ضلع بلیا** کے بیلتھرا روڈ واقع ایک گاؤں میں 15؍ اپریل **1912** میں ہوئی۔ **4؍جنوری 1983**ء کو کانپور میں ان کا **انتقال** ہوا۔

نشوؔر واحدی کا تعلق ایک علمی، ادبی اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد جمیل احمد بھی شاعر تھے اور یکتا تخلص لکھتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نشوؔر نے درس و تدریس کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا اور مختلف مدارس میں معلّمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1940ء میں گرونا رائن کھتری کالج، کانپور میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد 1947ء میں حلیم مسلم ڈگری کالج، کانپور میں شعبہ اردو میں استاد منتخب ہوگئے اور یہیں سے 30؍جون 1972ء کو اپنے تدریسی فرائض سے سبکدوش ہوئے۔

نشوؔر واحدی ابتدائی دور میں علامہ اقبالؔ کی شاعری سے متاثر تھے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں اقبالؔ کے افکار وخیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بعد کے زمانے میں وہ اقبالؔ کے اثر سے آزاد ہوئے اور اپنی شاعری کو اپنے افکار وخیالات اور احساسات و جذبات کا آئینہ دار بنایا۔ نظموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نئے قسم کی تشبیہات اور ماورائیت کا استعمال کرکے ایک خاص رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زیادہ تر غزلوں میں عاشقانہ رنگ کے ساتھ ساتھ عارفانہ آہنگ بھی ملتا ہے۔ وہ غزل کے مزاج داں ہیں۔ غزل کے مزاج کے مطابق ان کی زبان دلکش اور لہجہ نرم و نازک ہے۔ انھوں نے تقریباً نصف درجن شعری مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن میں 'فروغِ جام'، 'سوادِ منزل' اور 'گل افشانیِ گفتار' اہم ہیں جن میں شامل غزلوں سے ان کی غزل گوئی کے معیار کا اندازہ ہوتا

ہے۔ایک جدید غزل گو کی حیثیت سے اردو ادب میں نشوؔر کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

تعارف سبق: زیر درس سبق نشوؔر واحدی کی غزلیات سے ماخوذ ہے۔

(۱)

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں
کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں

گلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کِھلنا حُسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

جوانی جا رہی ہے اور میں محو تماشا ہوں
اڑی جاتی ہے منزل اور ٹھہرتا جا رہا ہوں میں

بہت اونچا اڑا لیکن اب اس اوجِ تخیّل سے
کسی دنیائے رنگیں میں اترتا جا رہا ہوں میں

نشؔور آخر کہاں تک فکر دنیا دل دکھائے گی
غمِ ہستی کو ذوقِ شعر کرتا جا رہا ہوں میں

(II)

وہ آئے اس طرف اور یوں بہ طرزِ خوشگوار آئے
اچانک جیسے محفل میں کہیں پھولوں کا ہار آئے

فلک نے چھین لیں رنگینیاں اور لوٹ لی نکہت
مرے اجڑے ہوئے گلشن میں کیا لے کر بہار آئے

وہ انساں کیا جو بے گانہ ہو ذوقِ زخم و خنجر سے
وہ مے کش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

نشوؔر اب زندگی پیمائشِ غم کے سوا کیا ہے
شبِ رخصت اگر گزرے تو شامِ انتظار آئے

(III)

سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے
زمانہ بیتا جاتا ہے کہانی ہوتی جاتی ہے

وہی ہے ضبطِ غم لیکن اب آنسو آئے جاتے ہیں
وہی ہے دل مگر اب آگ پانی ہوتی جاتی ہے

گزشتہ الفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے

نشوؔر اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے
نئی دنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

معنی اور اشارے:

شورش دوراں	زمانے کا ہنگامہ، زمانے کا فتنہ
دیدۂ گریاں	روتی ہوئی آنکھ، اشکبار آنکھ
صورت جاناں	محبوب کی صورت
اذن	اجازت، حکم
خرام	نازک چال
کہکشاں	چھوٹے چھوٹے ستاروں کی قطار
مے کش	شراب پینے والا، شرابی
صہبا	ایک طرح کی لال شراب
تلخی	کڑواہٹ، ترشی

معروضی سوالات:

1۔ نشؔور واحدی کب پیدا ہوئے؟

(i) 15 اپریل 1912 (ii) 10 مارچ 1915

(iii) 12 جون 1920 (iv) 25 جنوری 1930

2۔ نشؔور واحدی ابتدائی دور میں کس کی شاعری سے متاثر تھے؟

(i) حالؔی (ii) جوشؔ

(iii) اقبالؔ (iv) غالبؔ

3۔ نشؔور واحدی نے تقریباً کتنے شعری مجموعے لکھے ہیں؟

(i) نصف درجن　　(ii) ایک درجن

(iii) دو مجموعے　　(iv) پانچ مجموعے

4۔ نشوؔر واحدی کا انتقال کب ہوا؟

(i) 1983　　(ii) 1980

(iii) 1970　　(iv) 1990

5۔ سحر اور شام سے کچھ یوں گزر تا جا رہا ہوں میں/ کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں۔

یہ شعر کس شاعر کا ہے۔

(i) میر تقی میرؔ　　(ii) جذبیؔ

(iii) غالبؔ　　(iv) نشوؔر واحدی

مختصر ترین سوالات:

1۔ نشوؔر کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

2۔ نشوؔر واحدی نے درس و تدریس کا فریضہ کہاں انجام دیا؟

3۔ شاعری کے ابتدائی دور میں نشوؔر کس شاعر سے متاثر تھے؟

مختصر سوالات:

1۔ نشوؔر کے شعری مجموعوں کے نام لکھئے؟

2۔ نشوؔر واحدی نے کون کون سی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی؟

تفصیلی سوالات:

1۔ نشوؔر واحدی کے ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

2۔ نشوؔر واحدی کے غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجئے۔

3۔ درج ذیل غزل کی تشریح کیجئے۔

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جارہا ہوں میں
کہ جیتا جارہا ہوں اور مرتا جارہا ہوں میں

گلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھِلنا حُسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

2- مثنوی

مثنوی عربی الاصل لفظ ہے جو مثنیٰ سے مشتق ہے۔اس کے معنی دو دو کے ہوتے ہیں۔اصطلاح شعر میں مثنوی سے مُراد وہ صنف ہے جس کا ہر شعر غزل کے مطلع کی طرح ہم قافیہ ہم ردیف ہوتا ہے۔اس کی دو حیثیتیں ہیں۔اول ہیئتی اور دوم صنفی۔ ہیئت کے اعتبار سے وہ تمام منظوم کلام مثنوی کہلاتے ہیں جن کا ہر شعر ہم قافیہ وہم ردیف ہو اور اس کے اندر ربط وتسلسل پایا جائے۔ چوں کہ یہ ہیئت بیانیہ شاعری کے لیے زیادہ موزوں تھی، اس لیے اردو میں منظوم داستانیں اسی ہیئت میں لکھی گئیں اور ان داستانوں کو مثنوی کہا جانے لگا۔

مثنوی کا تعلق اردو کی قدیم اور کلاسیکی اصناف سے ہے۔بطور صنف اس میں تصنیف وتخلیق کا سلسلہ دکن سے شروع ہوتا ہے۔ بہمنی دور کے شاعر فخر دین نظامی کو اردو کا پہلا مثنوی نگار تسلیم کیا جاتا ہے جن کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔ دکن کی زمین مثنوی نگاری کے لیے نہایت ہی زرخیز ثابت ہوئی۔ملاّ وجہیؔ، ابن نشاطیؔ، غواصیؔ وغیرہ نے دکن میں اردو مثنوی کی روایت کو استحکام بخشا۔شمالی ہند کے مثنوی نگاروں میں میرؔ حسن، پنڈت دیا شنکر نسیمؔ، شوقؔ لکھنوی، علامہ الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، سردار جعفریؔ، کیفی اعظمیؔ، جمیلؔ مظہری وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو کی مشہور مثنویوں میں قطب مشتری، پھول بن، سحرالبیان، گلزار نسیم، زہر عشق وغیرہ ہیں۔

(1)

میر غلام حسنؔ

[پیدائش 1739/37ء، وفات 1786ء]

اصل نام میر غلام حسنؔ اور تخلص حسن تھا۔ میر غلام حسین ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔

جب دہلی کی حالت دگرگوں ہوئی تو میر حسن اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آ گئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا، جب آصف الدولہ نے لکھنو آباد کیا تو یہ بھی لکھنو چلے آئے۔ اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور یہیں 1786ء میں آسودۂ خاک ہوئے۔ مصحفیؔ نے ''شاعر شیریں بیاں'' سے مماده وفات نکالا۔

میر حسنؔ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے والد میر ضاحکؔ ایک مشہور شاعر تھے۔ چنانچہ میر حسنؔ نے ابتدا ہی میں ان سے اصلاح لی اور بعد میں خواجہ میر دردؔ کو کلام دکھانے لگے۔ لکھنو آنے کے بعد میر ضیاءؔ اور سوداؔ کی شاگردی اختیار کی۔

میر ضیاؔء کا رنگ ان کو پسند نہ آیا۔ لہٰذا میر دردؔ اور سوداؔ کے تتبع میں شعر کہنا شروع کیا۔

میر حسنؔ نے یوں تو مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ مگر ان کی شہرت کا دار و مدار ان کی مثنویوں خصوصاً سحر البیان پر ہے۔ یہ مثنوی 1785ء میں آصف الدولہ کے عہد میں لکھی گئی۔ اس مثنوی میں ایک پرانی داستان بیان کی گئی ہے۔ مگر انداز بیان ایسا دلکش اور مؤثر ہے کہ آج تک کوئی مثنوی اس کے مد مقابل نہ ہوسکی۔ یہ مثنوی سادگی بیان اور بے تکلفی کا عمدہ نمونہ ہے، صفائی و محاورے کا لطف اس مثنوی کا خاص وصف ہے، اس کے علاوہ یہ مثنوی ماحول کی عکاسی، منظر نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور حسن بیان کا دلکش اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ میر حسن محاکات اور جزئیات نگاری کے بہت دلدادہ نظر آتے ہیں اور انھوں نے مذکورہ شاعرانہ خصوصیات کو درجہ کمال تک پہنچادیا۔ یہ مثنوی اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہے جس سے اس زمانے کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مثنوی سحر البیان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا راز میر حسن کی فنکاری اور شاعرانہ کمال ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے دبستان دہلی کی سادگی، روانی اور سلاست اس مثنوی کا خاص وصف ہے۔ اصطلاحات، محاورات، کہاوتیں، تشبیہات و استعارات اور شعری صنعتوں کے فنکارانہ استعمال نے اس مثنوی کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ میر حسن نے '**گلزار ارم**'، '**رموز العارفین**' اور '**اخوان نعمت**' جیسی مثنویاں بھی تصنیف کیں مگر وہ سحر البیان کے مرتبے تک نہ پہنچ سکیں۔

اس مثنوی میں **بے نظیر** اور **بدر منیر** کی داستان بیان ہوئی ہے۔ ایک دن شہزادہ بے نظیر گھوڑے پر سیر کرتا ہوا بدر منیر کے باغ میں اترتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر عاشق ہوجاتے ہیں۔

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں

سنو ایک دن کی یہ تم واردات　　اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اس کا اِک جا گُزر　　سہانا سا اِک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند　　کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا　　وہ جاڑے کی آمد ، وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نِکھرا فلک اور مہ کا ظہور　　لگا شام سے صُبح تک وقت نور
یہ عالم جو بھایا ، تو کوٹھے پہ آ　　اُتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں　　کہ دیکھوں تو ، یاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر　　کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر
کہا جی سے ، اب تو جو کچھ ہو سو ہو　　ذرا چل کے اِس سَیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اُترا دبے پاؤں وہ　　نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
لگا واں سے چھپ چِھپ کے کرنے نظر　　درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھے تو صحبت عجب ہے وہاں　　عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طُرفہ محل　　چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل
ملی جنس کی اس کو جو اپنی بو　　لگا تکنے حیرت سے حیران ہو

نظر آئی واں چاندنی کی بہار   کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
درو بام یک لخت سارے سفید   ہر اک طاق ، محراب ، صبحِ امید
بِلوریں دھرے ہر طرف سنگِ فرش   کہ جس سے منور رہے رنگِ فرش
ہر اک سمت واں نور کا اژدِحام   لگے آئینے قدِ آدم تمام
ملبّب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر   پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
لب نہر پر صاف جو غور کی   تو پڑی تھی وہ ایک بِلّور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے   ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے
لیے گود مُقیّش چھوٹے بڑے   سبھی مہ ستارے اڑاویں کھڑے
غرض اپنی صنعت سے تاروں کو توڑ   زمیں کو فلک کا بناتے تھے جوڑ
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم   ملیں جلوۂ مہ کو زیر قدم
فقط چاندنی میں کہاں طور یہ   کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
کھڑا ایک نم گیرۂ زر نگار   کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
جڑاؤ وہ استادے الماس کے   ڈھلے ایک سانچے کے، اِک راس کے
کھنچی ڈور ہر طرف زر تار کی   لڑی جوں کناری کے ہوں ہار کی
کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھبن   کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن
مغرق بچھی مسند اک جگمگی   کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے   کہ تھے وے فقط حسن ہی سے بھرے

زمیں نور کی ، آسماں نور کا　　جدھر دیکھو اُودھر سماں نور کا
چمن سارے داؤدیوں سے بھرے　　جَوانانِ شبّو کے ہر جا پرے
ستاروں کا مہتاب میں حال یوں　　کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجیے سایے اوپر نگاہ　　تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہر و ماہ
کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر
بجُز نور ، آتا نہیں کچھ نظر

معنی اور اشارے:

وارد ہونا	پہنچنا، آجانا، اترنا، داخل ہونا
واردات	واقعہ، ماجرا، احوال
ناگہاں	اچانک
دوچند	دوگنا
ظہور	ظاہر ہونا، نمایاں ہونا
طُرفہ	نادر، انوکھا
خیرگی	چکاچوند
یک لخت	فوراً
بلوریں	ایک چمکدار معدنی جوہر، صاف، شفاف، چمکدار
اژدحام	بھیڑ، مجمع، ہجوم
مقیش	سونے چاندی کے تار، سونے چاندی کے تار کا بنا ہوا کپڑا، زری
نم گیرہ	شامیانہ، سائبان
آب دار	چمکیلا، صاف، لطیف ونفیس
استادہ	نصب کیا ہوا، کھڑا ہوا، گڑا ہوا
پھبن	زیبائش، آرائش، سجاوٹ
مغرق	جگمگاتا ہوا، چمکتا ہوا
شبّو	رات کی رانی، رات کو مہکنے والے ایک پھول کا نام

معروضی سوالات:

1۔ میر حسنؔ کا پورا نام ہے۔

(i) امیر حسنؔ (ii) میر غلام حسنؔ

(iii) احمد حسنؔ (iv) محمد حسنؔ

2۔ میر حسنؔ کی وفات کب ہوئی؟

(i) 1780ء (ii) 1781ء

(iii) 1782ء (iv) 1786ء

3۔ سحر البیان کے خالق ہیں۔

(i) میر حسنؔ (ii) نسیمؔ

(iii) شوقؔ قدوائی (iv) اقبالؔ

4۔ مثنوی سحر البیان کا سنۂ تصنیف ہے۔

(i) 1775ء (ii) 1771ء

(iii) 1785ء (iv) 1790ء

5۔ بے نظیر اور بدر منیر کی داستان کون سی مثنوی میں بیان کی گئی ہے۔

(i) گلزارِ نسیم میں (ii) سحر البیان میں

(iii) ساقی نامہ میں (iv) ترانۂ عشق میں

مختصر ترین سوالات:

1۔ میر حسنؔ کہاں کے رہنے والے تھے؟

2۔ میر حسن کا انتقال کب ہوا؟

3۔ مثنوی سحر البیان کا سنِ تصنیف کیا ہے؟

مختصر سوالات:

1۔ میر حسنؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

2۔ میر حسنؔ کی تین مثنویوں کے نام لکھیے۔

3۔ میر حسن کی شہرت کا اصل دار و مدار کس صنف پر ہے؟

4۔ مثنوی سحر البیان میں کس کی داستان بیان ہوئی ہے؟

تفصیلی سوالات:

1۔ مثنوی سحر البیان کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ زبان و بیان کے اعتبار سے مثنوی سحر البیان کس دبستان شاعری کی نمائندگی کرتی ہے؟

3۔ میر حسنؔ کی مثنوی نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

4۔ میر حسنؔ کی حالات زندگی مختصر بیان کیجیے۔

(2)

پنڈت دیا شنکر نسیم

[پیدائش 1811ء ، وفات 1843ء]

اصل نام **دیا شنکر** اور تخلص **نسیم** تھا۔ وہ ایک کشمیری الاصل برہمن پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے تھے۔ یہ خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گیا تھا۔ یہیں 1811ء دیا شنکر کی ولادت ہوئی۔ نسیم نے رواج زمانہ کے مطابق اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی اور اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیت کی بدولت بہت جلد شہرت حاصل کر لی، اور اٹھائیس برس کی عمر میں **''گلزارِ نسیم''** جیسے بے مثال مثنوی مکمل کر دی۔ مگر افسوس کہ موت نے بے وقت حملہ کیا اور صرف بتیس برس کی عمر میں 1843ء میں طاعون کی بیماری سے فوت ہوئے۔

نسیم نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ان کی غزلوں میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔دنیا کی بے ثباتی اور خودداری ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ان کے کلام میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ان کے زمانے میں عام تھی۔یعنی زبان کا لطف، محاورے کی صحت کا خیال، صنائع کے استعمال کا شوق، رعایت لفظی کی کثرت، لیکن اپنے استاد کی طرح زبان کے ساتھ ساتھ خیال کو بھی اہمیت دیتے تھے۔

''گلزار نسیم''اردو شاعری کے دبستان لکھنو کا اہم ترین کارنامہ ہے۔اس مثنوی میں اردو کا محاورہ اور لکھنو کا روزمرہ اپنی تمام وکمال خوبی وصفائی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔نسیم نے عام بول چال کے سیدھے سادے الفاظ کو اس شاعرانہ خوش سلیقگی سے استعمال کیا ہے کہ اشعار میں سہل ممتنع کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور تاثیر کا طلسم بندھ گیا ہے۔اس مثنوی کا خاص جوہر اختصار، پختگی کلام، تناسب لفظی اور بندش کی چستی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسب لفظی کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

اس مثنوی میں ''گل بکاولی'' کی مشہور داستان عشق بیان ہوئی ہے۔اس کے قصے میں مختلف قدیم داستانوں کے اجزاء ملے ہوئے ہیں۔یہ قصہ حقیقت اور افسانہ دونوں کا حسین امتزاج رکھتا ہے۔نسیم سے قبل مختلف لوگوں نے اس قصے کو نثر و نظم دونوں میں بیان کیا ہے۔نسیم نے مذہب عشق کے قصے کو بنیاد بنا کر کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہ مثنوی تصنیف کی اور گلزار نسیم کے نام سے دوآتشہ بنا کر پیش کیا۔

تاج الملوک گل بکاولی لے جاتا ہے اور صبح کو جب بکاولی بیدار ہوتی ہے اور پھول کو نہ پا کر اس کے دل ودماغ کو شدید صدمہ پہنچتا ہے۔یہاں پر نسیم نے بکاوَلی کے جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے اور ان تمام کیفیات، واردات اور جذبات کو بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔